HAMEED AZAD

WHATSAPP NO : ***03012995309***

DEPARTMENT : ***Hazara University mansehra***

دُرست اُردو

پروفیسر آسی ضیائی

ادارۂ معارفِ اسلامی ۔ لاہور

یکے از مطبوعات ادارۂ معارفِ اسلامی

نام مصنف : پروفیسر آسی ضیائی
نام کتاب : درست اُردُو
نام پریس : میٹرو پرنٹرز۔ لاہور
قیمت : ۳۶/- روپے
اشاعت دوم : (۱۱۰۰) ۱۹۹۱ء
اشاعت سوم : (۱۱۰۰) ۱۹۹۹ء

تقسیم کنندہ :

مکتبہ معارف اسلامی منصورہ ملتان روڈ لاہور
پوسٹ کوڈ ۵۴۵۷۰
فون ۵۴۱۹۵۲۰۔۷۸۳۰۰۳۳۔۴۴۸۰۲۲

فہرست مضامین

فصل دوم - خلافِ محاورہ و روزمرّہ - ۵۹

فصلِ سوم : خلافِ فصاحت

دوسرا باب

چھٹا باب

ساتواں باب

استدلال

یہ کتاب ۱۹۵۲ء میں پہلی بار شائع ہوئی تھی جب میں بھی زبان کی درستی کے بارے میں زیادہ حساس اور پُرجوش تھا اور پڑھنے والے بھی اپنی اغلاط کی اصلاح کے لیے زیادہ فکر مند رہتے تھے، لیکن اُڑتیس سال ـــــ ایک نسل ـــــ کی طویل مُدّت گزر جانے کے بعد صورتِ حال یہ ہے کہ میں صحتِ زبان کی طرف سے بے پروا، بلکہ افسردہ اور مایوس ہوگیا ہوں اور لکھنے والے غلطی کرنے پر زیادہ دلیر اور پُر اعتماد۔

اس عرصے میں جہاں ہمارے ملک میں ہر معاشرتی قدر کو توڑ پھوڑ ڈالنے کا رجحان ایک ہمہ گیر سیلاب کی طرح پھیل چکا ہے اور مزید پھیلتا جا رہا ہے، وہاں غریب قومی زبان کس گنتی میں ہے کہ اس کی بھی گت نہ بنائی جائے اور پھر اس پر فخر نہ محسوس کیا جائے! ساتھ ہی سہل انگاری اور عیش کوشی نے جہاں بندۂ مزدور تک کو کام چور، اگر حق سے بڑھ کر طلب کرنے پر آمادہ و بے شرم بنا دیا ہے وہاں اہلِ قلم بھی اس دوڑ میں پیچھے رہ جانا اپنی کسرِ شان سمجھنے لگے ہیں۔ انھیں اپنی "اغلاط کی لوٹ" نگارشاتِ نظم و نثر کو شاہکار منوانے پر تو شدید اصرار ہے مگر اصلاح کے لیے مطالعے اور تحقیق کی محنتِ شاقہ "اُٹھانا" غالباً اپنی توہین جانتے ہیں۔ رہے "پُرانی وضع" کے سنجیدہ ادیب، تو ان کے لیے اس طوفانِ غلط روی میں اپنی پگڑی بچانا ہی دشوار ہوگیا ہے اور روز بروز دشوار تر ہوتا جا رہا ہے لہٰذا ان کی اکثریت صبر کے گھونٹ پی کر "گدائے گوشہ نشینی، تو حافظا مخروش" کی تصویر بنی بیٹھی ہے۔ کبھی کبھار، کسی گوشے سے اس "نقار خانۂ بے ہنگام" میں کسی "طوطی" کی آواز بطور صدائے احتجاج

بلند بھی ہوتی ہے، تو ظاہر ہے کہ "کون سُنتا ہے فغانِ درویش"؟

ان حالات میں اس کتاب کو دوبارہ چھپوانا ——— اور وہ بھی اس طرح کہ اس کے مندرجات کی از سرِ نو تہذیب و تنقیح کر کے گویا اس کو کرر تصنیف کیا جائے ——— غالباً اکثر قارئین کے نزدیک ایک سعیٔ لاحاصل ہی متصوّر ہوگا جیسا کہ خود میرا اپنا بھی خیال ہے مگر مشفقِ عزیز، جناب حفیظ الرحمٰن احسن (مالکِ ایوانِ ادب) کا یہ تقاضا کئی سال سے مسلسل چلا آ رہا تھا اور اب اس کو مزید ٹالنا میرے بس میں نہ رہا تھا، اس لیے ہرچہ بادا باد، ایک بار پھر کوشش کر کے دیکھتا ہوں کہ اس کی کہاں تک پذیرائی ہوتی ہے، اور کتنے حضرات میں یہ سنجیدگی باقی رہ گئی ہے کہ زبان کی صحت و درستی کی طرف سے فکرمند ہوں۔

حفیظ صاحب کے اصرار کے علاوہ جس بات سے مجھے کسی قدر حوصلہ افزائی ہوئی وہ تحسینِ اُردو کی غیر معمولی مقبولیت ہے، جس کا میں ہی مصنّف ہوں، اور جس میں محاورہ و روزمرّہ اور اصلاحِ زبان وغیرہ کا حصّہ میرا ہی مرتب کردہ ہے۔ اسی سے کچھ خیال ہوتا ہے کہ شاید ملک میں ابھی کچھ لوگ ایسے ہیں جو اس قسم کی کوششوں کو لغو و لاطائل نہیں سمجھتے۔

یہ کتاب اصلاً تو پہلے بھی طالب علموں کے لیے لکھی گئی تھی اور اس بار بھی وہی پیشِ نظر ہیں، مگر جا بجا تھوڑی بہت علمی بحث جو چھیڑ دی گئی ہے اس کی بنا پر اندیشہ ہے کہ طالب علم ہی اس سے استفادہ کرنے میں سب سے پیچھے نہ رہ جائیں۔ ان کا تعلیمی معیار اس پورے عرصے میں جس بُری طرح انحطاط پذیر ہوا ہے، یہ اندیشہ اسی بنا پر ہے۔ طالب علم اب "علم" کے نہیں صرف "پاس ہو جانے" کے طالب رہ گئے ہیں (اِلّا ماشاء اللہ) اور ان کے لیے علمی بحثوں کو سمجھنا تو کجا، اُن پر نظر ڈالنا بھی بار ہو گیا ہے۔ اس لیے اساتذۂ کرام سے میری یہ گذارش بے جا نہ ہوگی کہ جن اغلاط کی نشان دہی اور جن کوتاہیوں کی طرف اشارے اس کتاب میں کیے گئے ہیں اور صحتِ زبان و بیان کے جو اصول پیش کیے گئے ہیں اُن

ان کا مطالعہ اچھی طرح خود فرما لیں اور پھر اپنے طلبہ کو نہ صرف سمجھائیں بلکہ اُن کی مشق بھی کرائیں اور نہ صرف ان کی بلکہ خود اپنی تحریر و تقریر میں بھی صحت و درستی کا اہتمام فرمائیں۔ اسی طرح توقع کی جا سکتی ہے کہ نئی نسل میں قومی زبان کا احترام اور اس سے محبت پیدا ہو اور لکھنے بولنے میں احساسِ ذمہ داری جھلکنے لگے۔ بلکہ کیا عجب ہے کہ اسی ریاض کی بدولت زندگی کے دوسرے شعبوں میں بھی ان کا رویہ احتیاط اور عافیت اندیشی کا ہو جائے۔

اہلِ علم سے گذارش ہے کہ اس میں جہاں کہیں کوئی خامی، فروگزاشت یا سہو پائیں اس سے مجھے ضرور مطلع فرمائیں، تاکہ میں اپنی بھی اصلاح کرتا رہوں اور کتاب کی بھی۔

آسی ضیائی

لاہور

$\frac{۸}{۹۰}$ ۲۷

پہلا باب

اِصلاحِ زبان

فصل اوّل: اغلاط

۱۔ نے کے دو غلط استعمال :

(الف) نے کے ساتھ فعل مصدری لانا۔

مثالیں :۔(۱) میں نے تم سے کچھ کہنا ہے۔

(۲) آپ نے ایسا نہ کرنا تھا۔

(۳) اُس نے لاہور تو جانا ہی ہوا۔

(۴) اب ہم نے تم سے بھلا کیا لینا ہے ؟

یہ اور اس طرح کے دوسرے جملے ، جن میں نے کے ساتھ فعل مصدری آتا ہے ، پنجابی روزمرہ میں داخل ہیں ، بلکہ پنجابی زبان کی قواعد کی رُو سے بھی درست ہیں۔ البتہ اُردو قواعد اور روزمرہ دونوں کی رُو سے ان کو کسی طرح درست قرار نہیں دیا جا سکتا۔ ایسے تمام مواقع پر نے کے بجائے کو استعمال ہوتا ہے یعنی ، ان جملوں کی صحیح شکل یہ ہوگی :۔

(۱) مجھ کو (مجھے) تم سے کچھ کہنا ہے۔

(۲) آپ کو ایسا نہ کرنا تھا۔

(۳) اُس کو لاہور تو جانا ہی ہے (ہوا خلافِ محاورہ ہے)۔

(۴) اب ہم کو (یا ہمیں) تم سے کیا لینا ہے ؟

آخری جملے کو اس طرح بھی لکھ سکتے ہیں" اب ہم بھلا تم سے کیا لیں؟" مگر ایسے جملوں میں فعل کو مضارع یا مستقبل بنانا بہتر ہوتا ہے۔ مثلاً
"پھر ہونا کیا تھا؟" کے بجائے "پھر ہوتا کیا؟" فصیح تر ہے۔
اسی طرح "گاڑی نے یہاں ٹھہرنا ہے" کے بجائے یہ دو جملے صحیح ہیں :۔
۱۔ گاڑی کو یہاں ٹھہرنا ہے۔
۲۔ گاڑی یہاں ٹھہرے گی۔
اور یہ دوسرا جملہ بہتر ہے۔
بعض دفعہ "کو" کے استعمال میں کسی قدر اُلجھن بھی پیش آ سکتی ہے مثلاً :۔
"میں نے تمہیں سو روپے دینے ہیں"
تو اگرچہ اس کی صحیح صورت یہ ہو گی "مجھ کو تم کو سو روپے دینے ہیں" لیکن اس "کو کی" تکرار کی وجہ سے یہ شکل پڑ سکتی ہے کہ یہاں سو روپے دینے والا کون ہے اور لینے والا کون۔ لہٰذا ایسے موقع پر اہلِ زبان کئی دوسری طرح کے جملے بولتے ہیں مثلاً
۱۔ مجھ کو تمہارے سو روپے دینے ہیں۔
۲۔ میں تمہیں سو روپے کا دین دار ہوں۔
۳۔ مجھ پر تمہارے سو روپے آتے ہیں، وغیرہ وغیرہ۔
(ب) "نے" کے ساتھ حالیہ تمام لانا۔
مثالیں :۔ ۱۔ میں نے لاہور دیکھا ہوا ہے۔
۲۔ اُس نے شراب پی ہوئی تھی۔
۳۔ ہم نے بچوں کے لیے بہت سی چیزیں منگوائی ہوئی ہیں۔
۴۔ تم نے یہ کیا تماشا بنایا ہوا ہے؟۔
۵۔ لڑکوں نے سارے کام کیے ہوئے ہیں۔

اس قسم کے جملے، میری تحقیق کے مطابق، اُردو قواعد کی رُو سے تو غلط نہیں کہے جا سکتے، اور بعض قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ اب سے کم از کم ڈھائی تین سو سال قبل دہلی یا دوسرے "اُردو علاقوں" کے لوگ اس طرح بول لیتے تھے، لیکن جب سے اُردو تحریر میں آئی ہے، ہمیں اس طرح کے استعمال کی کوئی ایک مثال بھی نہیں ملتی۔ اس لیے ہمیں قطعی طور پر کہنا پڑتا ہے کہ نے کے ساتھ حالیہ تمام کا استعمال ازروئے روزمرہ بالکل غلط ہے۔ مگر اب چند سال سے یہ غلطی اس قدر عام ہوگئی ہے کہ اخباروں، کتابوں، ریڈیو کے نشریوں اور حد یہ ہے کہ اسکول کی نصابی کتابوں میں بھی ــــ جنھیں بڑے بڑے "فاضل" حضرات مرتب کرتے ہیں ــــ بے تکلف نے کے ساتھ حالیہ تمام کا استعمال کیا جانے لگا ہے۔ اس "سیلابِ غلط بیانی" پر معترض ہونے والا بھی اپنی عافیت اسی میں دیکھتا ہے کہ خون کے گھونٹ پی کر چپ ہو رہے، اور اپنے اُوپر "رجعت پسندی" کا الزام نہ آنے دے!

بہر حال، ایک ناگوار اور ناگزیر فرض سمجھتے ہوئے ہم عرض کرنے پر مجبور ہیں، کہ مندرجہ بالا جملوں کو اس طرح لکھنا یا بولنا صحیح ہوگا:

۱۔ لاہور میرا دیکھا ہوا ہے۔
۲۔ وہ شراب پیے ہوئے تھا۔
۳۔ ہم نے بچوں کے لیے بہت سی چیزیں منگوائی ہیں۔
۴۔ تم نے یہ کیا تماشا بنا رکھا ہے؟
۵۔ لڑکوں نے سارے کام کر لیے ہیں۔

ان مثالوں سے معلوم ہوا ہوگا کہ نے کے ساتھ حالیہ تمام لانے سے بچنے کے لیے کم از کم پانچ طریقے اہلِ زبان میں مستعمل ہیں۔ گویا، مثلاً ایک جملے۔

"میں نے کیا ہوا ہے۔"

کی صحیح شکلیں یہ ہو سکتی ہیں :-

۱ - میرا کیا ہوا ہے ۔
۲ - میں کیے ہوتے ہوں ۔
۳ - میں نے کیا ہے ۔
۴ - میں نے کر رکھا ہے ۔
۵ - میں نے کر لیا (یا کر دیا) ہے ۔

ان میں سے جس موقعے پر جو صورت مناسب تر ہو وہی استعمال کی جاتی ہے ۔ مختصر یہ کرنے کے ساتھ ہوا، ہوتے وغیرہ کبھی نہیں آتے ۔

۲ - نہ ہی :

مثال :- "نہ تو آپ خود آئے ، اور نہ ہی کوئی خط بھیجا ۔"

اب سے چند سال پہلے تک اُردو کے اہلِ ذوق "نہ ہی" کے اس استعمال پر سخت مکدّر اور منغّض ہوتے تھے ، مگر اب یہ عالم ہے کہ شاذ ہی کوئی پڑھا لکھا اسے غلط سمجھتا ہوگا ۔ یہاں تک کہ اہلِ زبان ہونے کے دعوے داروں میں بھی بے تکلف "نہ ہی" لکھا جانے لگا ہے ۔ اگر "غلط العام" کے اُصول کی رُو سے دیکھا جائے تو ہمیں اس کو اب درست ہی مان لینا چاہیے مگر اوّل تو "غلط العام فصیح" کا اطلاق اور ہی حالات پر ہوتا ہے ، جو آج موجود نہیں ، اور دوسرے یہ کہ "نہ ہی" کی غلطی آج بھی صرف تحریر تک محدود ہے ۔ بول چال میں ، یہ صرف اُن عزیب کم خواندہ لوگوں کی زبان سے کبھی کبھی نکل جاتا ہے جو تحریری عبارت کو قولِ فیصل سمجھ کر اس کی تقلید گفتگو میں کرتے ہیں ۔ اس کے برعکس ، قدیم ترین تحریری اُردو میں بھی "نہ ہی" یکجا لکھا نہ دیکھا گیا ۔ "نہ" اور "ہی" کے بیچ میں کم از کم ایک لفظ ضرور ہوتا ہے ۔ شعراء کے ہاں اس کی بکثرت مثالیں ملتی ہیں ۔ مثلاً :- (۱) نہ خدا ہی ملا ، نہ وصالِ صنم ، نہ اِدھر کے رہے نہ اُدھر کے رہے ،

(گئے دونوں جہان کے کام سے ہم، نہ اِدھر کے رہے، نہ اُدھر کے رہے)

۲ ۔ نہ تو تُو رہا، نہ تو میں رہا، جو رہی سو بے خبری رہی (سراج دکنی)

۳ ۔ نہ تو نامہ ہی، نہ پیغامِ زبانی آیا (محزون دہلوی)

۴ ۔ پانی ہی اب پئیں گے، نہ کھانا ہی کھائیں گے (انیس لکھنوی)

دوسرا مصرع خاص طور پر قابلِ لحاظ ہے، "نہ تو تو رہا، نہ تو میں رہا"۔ میں دوسرا "تو" آج کل نہیں بولا جاتا۔ یہ قدیم روزمرہ ہے۔ اب اگر "نہ ہی" لکھنا درست ہوتا تو یہ مصرع اس طرح بڑی آسانی سے لکھا جا سکتا اور بڑا برجستہ ہوتا: "نہ تو تو رہا، نہ ہی میں رہا....."

جیسا کہ اُوپر ذکر ہوا، "نہ ہی" خلافِ روزمرہ تو ہے ہی، خلافِ قواعد بھی ہے۔ "ہی" حرفِ حصر و تخصیص ہے اور حرفِ تخصیص کے قریب اسمِ مخصوصہ ہونا ضروری ہے، جس کی تخصیص "ہی" کرے۔ لیکن "نہ ہی" میں اسم کوئی نہیں۔ پھر "ہی" کس کی تخصیص کرتا ہے؟

ایک دلچسپ موازنے سے مزید وضاحت ہو سکے گی۔ ایسے جملوں میں جن کی مثالیں اُوپر مذکور ہوئیں، "نہ" حرفِ عطف ہے۔ اسی طرح "یا" بھی حرفِ عطف ہے۔ مگر "نہ ہی" لکھنے والوں کو "یا ہی" لکھتے کبھی نہ دیکھا گیا، حالانکہ اگر یہ جملہ درست ہوتا:

"نہ تو آپ خود آئے اور نہ ہی کوئی خط بھیجا"

تو اس جملے میں بھی کوئی غلطی نہیں ہونا چاہیئے:

"یا تو آپ خود آتے اور یا ہی کوئی خط بھیجتے"

کیونکہ پہلے جملے میں "نہ" کا استعمال انگریزی حروفِ عطف (Neither - nor) کے مترادف ہے اور دوسرے جملے میں "یا" کا انگریزی مترادف (Either-or) ہوگا اور اس طرح، از روئے قواعد، "یا" اور "نہ" ہم مرتبہ ہیں، پس جو معاملہ ایک کے ساتھ غلط ہے، وہ دوسرے کے ساتھ کیونکر

صحیح ہوسکتا ہے؟

لہٰذا، ہم پورے اعتماد اور زور کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ "نہ" اور "ہی" کے درمیان کم از کم ایک لفظ (اسم) لازماً ہونا چاہیے، اور وہ بھی اُس صورت میں جب "ہی" کا لانا ناگزیر ہو، ورنہ بغیر "ہی" کے بھی جملہ صحیح ہوگا۔ چنانچہ اُوپر کی مثال میں جملے کی صحیح شکل یہ ہوگی :-

"نہ تو آپ خود آئے، اور نہ کوئی خط بھیجا"

اگر کوئی زور دینے کے لیے "ہی" لانا ضروری ہو تو اس طرح لکھا جائے گا :

۱ - "نہ تو آپ خود آئے اور نہ کوئی خط ہی بھیجا"

۲ - نہ تو آپ خود ہی آئے اور نہ کوئی خط بھیجا۔

۳ - نہ تو آپ خود ہی آئے اور نہ کوئی خط ہی بھیجا۔

جملے کی یہ تینوں شکلیں بالکل درست ہیں، مگر اہلِ زبان کے عام روز مرّہ کے مطابق دوسری شکل سب سے بہتر ہے۔

۳ - دوران :

مثال :- اس سال کے دوران ملک بھر کے تعلیمی ادارے کم و بیش پانچ ماہ بند رہے۔

پچھلے چند سال سے "دوران" کے ساتھ "میں" نہ لانے کا رُجحان اس قدر زور پکڑ گیا ہے کہ اب اکثر لوگوں کو غالباً یاد بھی نہیں رہا کہ کبھی "دوران میں" لکھا جاتا تھا مگر غلطی بہرحال غلطی ہی ہے۔ اُوپر کے جملے کی صحیح شکل یہ ہوگی :-

"اس سال کے دوران میں ملک بھر کے ......" الخ

جہاں تک مجھے یاد ہے، ۱۹۵۵ء سے پہلے اس عجیب و غریب رُجحان سے اہلِ قلم بالکل ناواقف تھے مگر یہ جان لینا چاہیئے کہ "دوران" کے ساتھ "میں" لانا

اُتنا ہی ضروری ہے جتنا "اثنا" کے ساتھ۔ مثلاً

" اسی اثنا میں ایک غیر معمولی واقعہ ظہور پذیر ہوا۔"

اس جملے کو اس طرح کوئی نہیں لکھتا: "اسی اثنا ایک غیر معمولی واقعہ۔"

۴۔ کیا گیا کام:۔

مثالیں: (۱) اپنے اعزاز میں دی گئی دعوت کے موقع پر قومی رہنما نے مختصر تقریر بھی کی۔

(۲) کیا تم نے گھر کے لیے دیا گیا اسکول کا کام پورا کر لیا ہے؟

یہ رجحان بھی بالکل جدید ہے اور اہلِ ذوق پر سخت گراں گذرتا ہے۔ غالباً یہ انگریزی کے لفظی ترجمے کی کوشش کا نتیجہ ہے۔ ان جملوں میں سے پہلے میں "دی گئی دعوت" کے بجائے "دی جانے والی دعوت" اور دوسرے میں "دیا گیا" کے بجائے "دیا ہوا" لکھنا چاہیے۔

۵۔ برائے مہربانی:

اس کا صحیح اِملا "براہِ مہربانی" ہے۔

۶۔ گالیاں نکالنا:

اُردو کا محاورہ "گالیاں نکالنا" نہیں۔ اس کی جگہ "گالیاں دینا" یا "گالیاں بکنا" بولا جاتا ہے۔

۷۔ اہالیان:

"اہل" خود جمع کے لیے آتا ہے۔ اس کی جمع "اہالیان" درست نہیں۔ مثلاً "اہالیان لاہور" کے بجائے "اہلِ لاہور" درست ہے۔

۸۔ نئی جدّت:

مثال:۔ تم تو ہر بات میں ایک نئی جدّت پیدا کرتے ہو۔

"جدت" کے معنی نئی چیز یا بات کے ہیں۔ لہٰذا جدت کے ساتھ "نئی" لانا بالکل زائد اور غلط ہے۔

۹۔ اِستفادہ حاصل کرنا:

مثال :- طلبہ کو اپنے اُستادوں سے پورا پورا استفادہ حاصل کرنا چاہیے۔
"استفادہ" کے معنی خود ہی فائدہ حاصل کرنا ہیں۔ لہٰذا "حاصل" بڑھانا غلط ہے۔
"استفادہ کرنا" کافی اور صحیح ہے۔

۱۰۔ تقرّری، تنزّلی :

دونوں غلط ہیں۔ صحیح لفظ "تقرّر" اور "تنزل" ہیں۔

۱۱۔ سطحِ سمندر، وغیرہ :- (ہندی الفاظ کے ساتھ فارسی تراکیب)

مثالیں :۱۔ یہ پہاڑ سطحِ سمندر سے پانچ ہزار فیٹ بلند ہے
۲۔ مظلوم کی چیخ و پکار کا جلاّد پر کوئی اثر نہ ہوا۔
۳۔ کس سوچ و بچار میں پڑے ہو۔

اُردو میں فارسی عربی الفاظ کے ساتھ ہندی یا انگریزی الفاظ لاکر ترکیب بنانا ایک بڑی غلطی ہے، جو آج کل بہت عام ہو گئی ہے۔ اسی طرح دو ہندی الفاظ کو بھی فارسی ترکیب کے ذریعے باہم ملانا غلط ہے۔ اُوپر کے جملوں میں یہی غلطیاں ہیں۔ پہلے جملے میں "سمندر" ہندی لفظ ہے، اس لیے "سطحِ سمندر" کی ترکیب غلط ہے۔ اس کی جگہ "سطحِ بحر" یا "سمندر کی سطح" لکھنا چاہیئے۔ دوسرے جملے میں "چیخ" اور "پکار" ہندی الفاظ ہیں اور تیسرے جملے میں "سوچ" اور "بچار" بھی ہندی ہیں۔ ان کے درمیان فارسی واؤ لانا درست نہیں۔ ان کی جگہ "چیخ پکار" اور "سوچ بچار" درست ہیں اور یہی اُردو کا روزمرہ بھی ہے۔

تنبیہہ :- بعض ایسی تراکیب بھی اُردو میں رائج ہو چکی ہیں جو اس اصول کی رُو سے غلط ہونی چاہئیں، مگر انھیں یا تو اہلِ زبان نے استعمال کیا ہے، یا وہ پولیس، کچہری اور عدالت وغیرہ کی اصطلاحیں بن گئی ہیں، مثلاً، لبِ سڑک، آلۂ دھاردار، قانونِ لگان، ممبرِ اسمبلی وغیرہ۔ انھیں غلط نہیں کہا جاسکتا۔ لیکن ان پر قیاس کر کے اپنی طرف

سے اگر کچھ اور تراکیب بنا ڈالی جائیں تو یہ درست نہ ہوگا۔

۱۲۔ نقضِ امن :

مثال :۔ پولیس نے اندیشۂ نقضِ امن کے تحت چار افراد کو گرفتار کرلیا۔

"نَقص" کے معنی کمی کے ہیں اور "نَقض" کے معنی توڑنا یا درہم برہم کرنا۔ لہٰذا ظاہر ہے کہ "نقصِ امن" یہاں درست نہیں۔ صحیح "نقضِ امن" ہے۔ ایک نقطے کے فرق سے معنی کچھ کے کچھ ہوگئے۔

۱۳۔ تشہیر :

مثال :۔ ہماری کمپنی کے مال کی تشہیر کے لیے ہوشیار اور محنتی ایجنٹوں کی ضرورت ہے۔

"تشہیر قدیم زمانے سے ذلیل اور رُسوا کرنے کے معنوں میں آتا ہے۔ مثلاً "چور کا منہ کالا کرکے گدھے پر سوار کیا گیا اور سارے شہر میں پھرا کر تشہیر کی گئی"۔ لیکن آج کل غلطی سے یہ اشتہار یا پبلسٹی (Publicity) کے معنوں میں استعمال ہونے لگا ہے۔ اس کے بجائے "اشتہار" یا "مشتہری" جیسا لفظ ہونا چاہیے۔

۱۴۔ کارروائی، قائمقام :

ان دونوں لفظوں میں ایک ایک حرف کم ہے۔ صحیح لفظ "کارروائی" اور "قائم مقام" ہیں۔

۱۵۔ اعلانیہ، پرواہ :

صحیح لفظ "علانیہ" ہے۔ اس میں خواہ مخواہ ایک زائد بڑھانا غلط ہے۔ اسی طرح "پروا" صحیح لفظ ہے، نہ کہ "پرواہ"

۱۶۔ سمجھ نہ آنا :

مثالیں :۔ (۱) مجھے تمھاری بات کی سمجھ نہ آئی۔

۲۔ سمجھ نہیں آتی کہ ہمارا کیا حشر ہونا ہے۔

ان موقعوں پر "سمجھ نہ آنا"، خلافِ روزمرہ ہے۔ یہ جملے اس طرح صحیح ہوں گے:۔

۱۔ میری سمجھ میں تمھاری بات نہ آئی۔ یا میں تمھاری بات نہ سمجھا۔

۲۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ ہمارا کیا حشر ہونا ہے۔

"سمجھ نہ آنا"، عقلاً بھی غلط ہے۔ سمجھ وہ ذہنی قوت ہے جس کے ذریعے کسی بات کا علم حاصل ہو، اور ظاہر ہے کہ یہ قوت دماغ میں پہلے ہی سے موجود رہتی ہے۔ اس کے آنے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔

البتہ اگر یہ کہنا مقصود ہو کہ دماغ ابھی بالکل کسی بات کے بھی سمجھنے کی اہلیت نہیں رکھتا، تب "سمجھ نہ آنا" کا استعمال درست ہو سکتا ہے۔ مثلاً:

"تم اتنے بڑے ہو گئے، ابھی تک تمھیں سمجھ نہ آئی، جو بالکل بچوں کی سی باتیں کرتے ہو۔"

۱۷۔ چونکہ، کیونکہ:

اگرچہ یہ دونوں الفاظ ہم معنی ہیں، مگر ان کے استعمال میں ذرا سا فرق ہے مثلاً:

۱۔ چونکہ یہ تمھاری پہلی خطا ہے اس لیے میں تمھیں چھوڑے دے رہا ہوں۔

۲۔ میں تمھیں چھوڑے دے رہا ہوں، کیونکہ یہ تمھاری پہلی خطا ہے۔

یعنی اگر جملہ سببیہ پہلے ہو تو "چونکہ" سے شروع ہوگا، اور اگر بعد میں ہو تو "کیونکہ" سے شروع ہوگا۔ پہلی صورت میں "چونکہ" کا جواب "اس لیے" یا "لہٰذا" سے ظاہر ہوتا ہے، مگر دوسری صورت میں اس کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی۔

۱۸۔ اِس لیے ..... کیونکہ، اس لیے ..... تاکہ

مثالیں :- ۱۔ مَیں اس لیے مسلمان ہوں کیونکہ میں نے اسلام ہی کو دینِ حق پایا ہے۔
۲۔ مَیں تمھیں اس لیے نصیحت کرتا ہوں تاکہ تم بُرائیوں سے بچو۔
دونوں جملوں میں "کیوں کہ" اور "تاکہ" کے بجائے صرف "کہ" لانا کافی ہے۔ یعنی:
۱۔ مَیں اس لیے مسلمان ہوں کہ میں نے .... الخ
۲۔ مَیں تمھیں اس لیے نصیحت کرتا ہوں کہ تم .... الخ
البتہ اگر ان جملوں میں "اس لیے" نہ لایا جائے تو "کیونکہ" اور "تاکہ" لانا درست ہوگا۔

یعنی :-
۱۔ میں مسلمان ہوں، کیونکہ میں نے ...... الخ
۲۔ میں تمھیں نصیحت کرتا ہوں تاکہ تم ...... الخ
"اس لیے" کے ساتھ "تاکہ" قدیم اُردو میں استعمال ہوتا تھا، اور موجودہ زمانے میں علما، دین کی تحریروں میں بھی مل جاتا ہے اس لیے اس کو بالکل غلط تو نہیں کہا جاسکتا، البتہ خلافِ فصاحت ضرور ہے۔ اس کے برعکس "اس لیے" کے ساتھ "کیونکہ" کی مثال قدیم و جدید فصحا، دونوں کے یہاں مفقود ہے۔

۱۹۔ کرنے لگ پڑنا یا لگ جانا :

مثالیں : (۱) میرے بُرا بھلا کہنے پر وہ رونے لگ پڑا۔
۲۔ ماسٹر صاحب ذرا سے قصور پر بچوں کو بے تحاشا مارنے لگ جاتے ہیں۔
"لگ پڑنا" "یا لگ جانا" ان موقعوں پر اُردو محاورے کے خلاف ہیں۔ پہلے جملے میں "رونے لگ پڑا" کے بجائے صرف "رونے لگا" کافی ہے۔ زیادہ زور دینا ہو تو "رونے بیٹھ گیا" ٹھیک رہے گا (یہاں "بیٹھنا" اپنے اصلی معنی کے بجائے محاورے کے طور پر استعمال ہوا ہے) دوسرے جملے میں "مارنے لگ جاتے ہیں" کی جگہ "مارنے لگتے ہیں" کافی ہے۔

ویسے ،صرف "لگ پڑنا" ایک الگ محاورہ ہے ،جس کے معنی پیچھے پڑ جانے کے ہیں ۔مثلاً ؎

اُٹھ گیا پردہ ،نصیحت گر کے لگ پڑنے سے ،میرؔ
پھاڑ ڈالا میں گریباں ،رات کو ،داماں سمیت (میرتقی)

اسی طرح "لگ جانا" بھی اس صورت میں جائز ہے کہ اس سے پہلے "میں" ضرور آئے ۔مثلاً :

۱ ۔ وہ چپ چاپ اپنا کام کرنے میں لگ گیا ۔
۲ ۔ تم کیوں باتیں بنانے میں لگ گئے ۔ جاؤ ، اپنا کام کرو ۔

۲۰ ۔ کئی ، بہت ، چند ، بعض وغیرہ ۔

یہ الفاظ اسمائے عدد کے طور پر آتے ہیں ،مگر ان کے استعمال کا فرق بہت کم لوگوں کو معلوم ہے ۔جہاں تک ہمیں معلوم ہے ، یہ فرق اس سے قبل کسی قواعد یا لغت میں وضاحت سے نہیں بتایا گیا ۔

یہ اسماء ، چونکہ اصل میں صفات ہیں ، اس لیے آئندہ انھیں اسماء عدد کے بجائے **صفات عددی** لکھا جائے گا ۔

یہ صفات تین قسم کی ہیں :۔

۱ ۔ قلّت ظاہر کرنے والی
۲ ۔ کثرت ظاہر کرنے والی
۳ ۔ کلّیت ظاہر کرنے والی ،

(۱) **قلّت ظاہر کرنے والی صفات :** یعنی جن چیزوں کی تعداد میں تھوڑا ہونا ظاہر ہوتا ہے یہ ہیں :۔

چند ، بعض ، کچھ ۔

[ان کے علاوہ کم، کم تر، تھوڑے وغیرہ بھی ہیں، مگر ان کے استعمال کا فرق بالعموم معلوم ہے، اس لیے ان کی تشریح کی ضرورت نہیں۔]

(الف) چند:۔ چند کی تعداد معیّن ہے۔ یہ دو سے لے کر نو یا دس تک کے لیے بولا جاتا ہے۔ اس سے مراد کم تعداد لی جاتی ہے۔ مثلاً:

"میں نے چند آدمیوں کی زبانی یہ خبر سُنی۔"

یعنی، یہ خبر مجھے بہت زیادہ آدمیوں نے نہیں سُنائی، بلکہ بہت تھوڑے آدمیوں نے سُنائی، جن کی تعداد نو دس سے زیادہ نہیں (بعض لوگ چند کی بجائے چندایک لکھتے ہیں۔ مگر یہ غیر فصیح ہے۔)

(ب) بعض:۔ بعض کی تعداد معین نہیں، مگر اس میں کثیر تعداد سے نسبت پائی جاتی ہے۔ مثلاً:

"بعض لوگوں کا خیال ہے کہ تیسری عالم گیر جنگ نہیں ہو گی۔"

یعنی، ایک کثیر تعداد کے مقابلے میں نسبتاً تھوڑے سے (مثلاً، دس یا پندرہ فیصدی، غرض آدھے سے کم) لوگوں کا خیال ہے کہ جنگ نہ ہو گی۔

(ج) کچھ:۔ اس کی تعداد بھی معیّن نہیں، اور اس میں کثیر تعداد سے نسبت بھی نہیں پائی جاتی۔ مثلاً:

"کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ تیسری عالمگیر جنگ نہیں ہو گی۔"

یعنی، یہ خیال ایک غیر واضح تھوڑی تعداد کا ہے۔ یہ تھوڑی تعداد دس سے بھی کم ہو سکتی ہے اور لاکھ دو لاکھ بھی۔ جس موقع پر عقل فیصلہ کرے کہ اتنی تعداد کو تھوڑا کہا جائے گا وہی تعداد اُس موقع کے لیے تھوڑی ہو گی، اور اس کے لیے کچھ کا استعمال درست ہو گا۔

(۲) کثرت ظاہر کرنے والی صفات، یعنی جن چیزوں کا تعداد میں زیادہ ہونا

ظاہر ہوتا ہے، یہ ہیں :۔
— کئی، اکثر، بہت ۔
(ان کے علاوہ زیادہ، زیادہ تر، بیشتر، لاتعداد وغیرہ بھی ہیں، مگر ان کا فرق بھی عموماً معلوم ہے ۔)

(الف) کئی :۔ یہ لفظ چند کی ضد ہے، اور اس کی تعداد بھی دو سے لے کر نو دس تک معین ہے ۔ مگر جیسا اُوپر مذکور ہوا، چند کا استعمال زیادہ کے مقابلے میں کمی ظاہر کرنے کے لیے ہوتا ہے، اور کئی، اس کے برعکس، ایک کے مقابلے میں زیادتی ظاہر کرنے کے لیے آتا ہے مثلاً :

"میں نے کئی آدمیوں کی زبانی یہ خبر سُنی ۔"

یعنی، میں نے ایک آدمی سے نہیں، ایک سے زیادہ آدمیوں سے سُنی جن کی تعداد نو دس تک ہو سکتی ہے ۔

(ب) اکثر :۔ یہ بعض کی ضد ہے یعنی جس طرح بعض میں بڑی تعداد سے نسبت اور مقابلہ پایا جاتا ہے ۔ اسی طرح اکثر میں تھوڑی تعداد سے ۔ مثلاً :

"اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ جنگ نہیں ہوگی ۔"

یہاں اکثر سے مراد زیادہ تعداد ہے ۔ مگر واضح رہے کہ اکثر ہمیشہ آدھی سے زیادہ تعداد کے لیے نہیں آتا ۔ اس جملے میں اکثر کا مطلب "آدھے سے زیادہ" نہیں، بلکہ صرف مبالغہ اور زیادتی دکھانے کے لیے بولا گیا ہے ۔ آدھی سے زیادہ تعداد کے لیے مخصوص لفظ بیشتر ہے ۔ اس جملے میں اکثر کی جگہ بیشتر لگا دینے سے لازماً "آدھے سے زیادہ لوگ" مراد ہوں گے ۔

بعض اوقات یہ دو نوں لفظ ملا کر بھی استعمال کیے جاتے ہیں مثلاً :۔

۱ - اکثر و بیشتر لوگ اس خیال کے حامی ہیں۔
۲ - مجھے اکثر و بیشتر وہاں جانے کا اتفاق ہوا۔

پہلے جملے میں "اکثر و بیشتر" کا موصوف "لوگ" موجود ہے اور دوسرے میں (مرتبہ یا دفعہ) محذوف ہے۔ اگر موصوف جملے میں موجود ہو تو "اکثر و بیشتر" کا مطلب آدھی سے زیادہ تعداد ہوگا اور اگر محذوف ہو تو فقط کثرتِ تعداد۔ چنانچہ پہلے جملے کا مطلب ہے کہ آدھے سے زیادہ لوگ اس خیال کے حامی ہیں اور دوسرے کا مطلب ہے کہ مجھے وہاں بہت سی مرتبہ جانے کا اتفاق ہوا۔

(ج) **بہت**: بہت یا بہت سے ضد ہے کچھ کی: یعنی جس طرح کچھ کی تعداد معیّن نہیں، اسی طرح بہت کی بھی معیّن نہیں۔ مثلاً:

۱ - میں نے بہت سے آدمیوں کی زبانی یہ خبر سُنی۔
۲ - بہت لوگ، بن کر ہوا خواہِ اُمّت
پڑے پھرتے ہیں، کرتے تحصیلِ دولت (حالی)

دونوں مثالوں میں بہت سے اور بہت، کثرتِ تعداد کے لیے آئے ہیں۔ یہ کثرت بالعموم دس سے زیادہ مانی جاتی ہے۔ اس سے بھی زیادہ تعداد کے لیے کثیر، لاتعداد، بےشمار، اَن گنت بولے جاتے ہیں۔

اس تمام تفصیل سے اندازہ ہُوا ہوگا کہ اس قسم کے جملے:-

۱ - اس سال کئی لوگوں نے حج کیا۔
۲ - کئی دفعہ مجھے اپنی قوم کی حالت دیکھ کر دُکھ ہوتا ہے۔

کئی کے غلط استعمال کی مثالیں ہیں۔ پہلے جملے میں کئی کی جگہ بہت سے آنا چاہیے، کیونکہ کہنے والے کا مقصد حج کرنے والوں کی کثیر تعداد بتانا ہے، مگر کئی اس تعداد کو دس تک محدود کر دیتا ہے۔ دوسرے جملے میں کئی کی جگہ اکثر آنا چاہیے۔

جس کے ساتھ دفعہ کی ضرورت نہیں رہتی، یعنی یہ جملہ یوں صحیح ہوگا :

"اکثر مجھے اپنی قوم .... الخ

ورنہ کئی دفعہ سے مطلب یہ ہوگا کہ ایک متعین تعداد میں (مثلاً پانچ مرتبہ) مجھے قوم کی حالت دیکھ کر دکھ ہوتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ یہاں یہ مطلب ہرگز مراد نہیں۔

۳۔ کُلّیت ظاہر کرنے والی صفات : یعنی جو کسی پوری تعداد کے لیے آتی ہیں۔ یہ صفات یہ ہیں :۔

سب، سارے (یا ساری)، تمام، کُل۔

(الف) معنی کے لحاظ سے سب اور سارے میں کوئی فرق نہیں بعض علماً کا خیال ہے کہ سارا صفتِ عددی نہیں، صفتِ مقداری ہے اور سب صفتِ مقداری نہیں، صفت عددی ہے، یعنی، ان کے خیال میں، "سارے لوگ" غلط ہے، اس کی جگہ "سب لوگ" بولنا چاہیے۔ اور اسی طرح "سب پانی" کے بجائے "سارا پانی" درست ہے۔ مگر میں نے اہل زبان کی بول چال کے علاوہ اساتذۂ شعر کے کلام کا مطالعہ کرکے نتیجہ نکالا ہے کہ سب اور سارا دونوں صفاتِ عددی بھی ہیں اور صفاتِ مقداری بھی۔ مثلاً :

کہتے ہو تم کو ہوش نہیں اضطراب میں (مومن)
سارے گلے تمام ہوئے اِک جواب میں

اس میں "سارے گلے" کا مطلب "سب گلے" ہے، اور اس طرح یہاں "سارے" صفتِ عددی ہے۔ اس کے برخلاف ؎

گلشن خجل تھے وادیٔ مینو اساس سے
جنگل تھا سب بسا ہوا پھولوں کی باس سے (انیس)

یہاں "سب جنگل" کا مطلب "سارا جنگل" ہے۔ یعنی "سب" یہاں صفتِ مقداری

ہے۔ اسی طرح روزمرہ کی بول چال میں بھی سب اور سارا عدد اور مقدار دونوں کے لیے آتے ہیں۔ البتہ سب بطورِ صفتِ مقداری بہت کم آتا ہے۔

بہرحال بحیثیت صفتِ عددی سب اور سارے میں ایک فرق یہ ہے کہ سارے میں سب سے ذرا زیادہ زور ہے۔ مثلاً، اوپر مومن کے شعر میں "سارے گلے" کے مقابلے میں "سب گلے" لایا جاتا تو اتنا زور، حصر اور تاکید نہ ہوتی۔

دوسرا فرق یہ ہے کہ سارے کا موصوف کبھی محذوف نہیں ہوتا۔ اُس کا "سارے" سے آگے یا پیچھے ہونا ضروری نہیں ہے مثلاً:

۱۔ یہ ساری باتیں خوب ذہن نشین کرو۔

۲۔ فائر کی آواز سُن کر جانور سارے بھاگ گئے۔

پہلے جملے میں موصوف (باتیں) صفت کے بعد، یعنی صحیح مقام پر ہے۔ دوسرے میں (جانور) صفت سے فوراً پہلے آیا ہے، جو اگرچہ اُس کا صحیح مقام نہیں، مگر بول چال میں زور دینے کے لیے اس طرح بھی آتا ہے۔ البتہ یہ جملے سارے کے غلط استعمال کی مثالیں ہیں:۔

۱۔ مجمع میں جتنے بھلے آدمی تھے، سارے یہ سُن کر ملول ہوئے۔

۲۔ سوال: تمھارے ساتھی کہاں ہیں؟

جواب: سارے چلے گئے۔

ان دونوں جملوں میں سب استعمال کرنا چاہیے، کیونکہ ان کے موصوف محذوف ہیں۔

شاید کسی کو یہ خیال ہو کہ پہلے جملے میں سارے کا موصوف آدمی موجود ہے۔

پھر اس کا استعمال کیوں درست نہیں ؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ جملہ دو جملوں سے مل کر بنا ہے :

۱۔ مجمع میں جتنے آدمی تھے ،

۲۔ سارے یہ سُن کر ملول ہوئے ۔

پہلے جُز میں فعل "تھے" کا فاعل[1] "آدمی" ہے ، اور دوسرے جُز کے فعل "ہوئے" کا فاعل محذوف ہے ۔ اِس فعل کا فاعل یا تو "وہ" ہونا چاہیے (یعنی پورا جملہ اس طرح ہوتا : "وہ سارے یہ سُن کر ملول ہوئے") یا "وہ" کا بدل "آدمی" مانا جائے ۔ یعنی جملہ اس طرح ہو : "وہ سارے آدمی یہ سُن کر ملول ہوئے" دونوں مفروضہ صورتوں میں صفت عددی "سارے" کا موصوف محذوف ہے ۔

تیسرا فرق ، جو در اصل دوسرے فرق ہی کی ایک شاخ ہے ، یہ ہے کہ سب کے بعد حرفِ جار بھی آسکتا ہے ، لیکن سارے اگر صفتِ عددی کے طور پر آئے تو اس کے بعد حرفِ جار نہیں آسکتا ۔ مثلاً "سب نے" ، "سب کو" "سب سے" وغیرہ درست ہے (کبھی کبھی سب کی جگہ سبھوں بھی بولتے ہیں مثلاً سبھوں نے ، سبھوں سے) مگر ساروں نے ساروں کو وغیرہ کبھی نہیں آتا ۔

(ب) تمام کا استعمال ہر حال میں موصوف سے پہلے ہونا چاہیے ، موصوف کے بعد لانا بالکل غلط ہے ۔ مثلاً :۔

۱۔ وہ لوگ ، جن تک یہ پیغام پہنچا ، تمام اس کی افادیت کے قائل ہوگئے ۔

---

[1] عربی اصولِ قواعد کی رُو سے "تھا" چونکہ فعلِ ناقص ہے ، اس لیے "آدمی" کو اس کا فاعل کہنا درست نہیں ، یہ فعلِ ناقص کا اسم کہلاتا ہے ۔ مگر ہم نے یہاں سہولت کی خاطر اُسے فاعل ہی قرار دیا ہے ۔ موجودہ دور کے بعض مستند اُردو قواعد نگار بھی اسے فاعل ہی مانتے ہیں ۔

۲ - میرے کام کی چیزیں تمام اس کمرے میں ہیں ۔
دونوں جملوں میں تمام پہلے آنا چاہیئے ۔ یعنی :-
۱ - وہ تمام لوگ .... الخ
۲ - میرے کام کی تمام چیزیں .... الخ
اسی طرح "تمام کے تمام" بھی غلط ہے ۔ اس کی جگہ "سب کے سب" یا "کُل کے کُل" آنا چاہیئے ۔

(ج) کُل ان چاروں لفظوں میں سب سے زیادہ واضح اور قطعی معنی رکھتا ہے ۔ سب ، سارے اور تمام میں اجتماعیت پائی جاتی ہے ، مگر کُل میں انفرادیت کی طرف بھی اشارہ ملتا ہے ۔ مثلاً :-
۱ - اس شہر کی ساری آبادی خوشحال ہے ۔
۲ - " " " تمام " "
۳ - " " " کُل " "
پہلے دونوں جملوں میں آبادی کی مجموعی خوشحالی کی طرف اشارہ ہے ۔ مگر تیسرے جملے سے معلوم ہوتا ہے کہ شہر کی آبادی کا ہر فرد خوشحال ہے ۔

۱۲ - ہوتا ہے ، ہوا کرتا ہے ، وغیرہ :
مثالیں :- ۱ - میرا بھائی آج کل کراچی ہوتا ہے ۔
۲ - یہاں ایک زمانے میں بڑا سا مکان ہوا کرتا تھا (یا ہوتا تھا)
۳ - احمد پہلے میرا گہرا دوست ہوتا تھا ۔
ہوتا ہے ، ہوا کرتا ہے وغیرہ صرف ان موقعوں پر آتے ہیں :-
(الف) جب کوئی بات یا واقعہ بار بار ہو ، مثلاً :-
۱ - شادیوں میں بڑی بدانتظامی ہوتی ہے ۔

۲۔ پہلے، ہمارے ہاں ہر سال عرس ہوا کرتا تھا۔

(ب) جب کسی اسم عام کی کسی خصوصیت کا ذکر مقصود ہو، مثلاً:۔

۱۔ طوطے کی چونچ لال ہوتی ہے۔

۲۔ اہلِ لکھنؤ کی گفتگو بہت دلچسپ ہوتی ہے۔

۳۔ بنگالیوں کے بال بہت گھنے ہوتے ہیں۔

ان مثالوں میں قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ کسی مثال میں فعل ماضی "تھا، تھی" نہیں آیا، کیونکہ یہ اسمِ عام کی خصوصیت کا بیان ہے، اور خصوصیت چونکہ ہمیشہ رہتی ہے اس لیے فعل ماضی نہیں لایا جا سکتا۔

(ج) جب انسانوں کے کسی گروہ، قوم، نسل وغیرہ کی پیدائشی خصوصیات بیان کرنی ہوں، مثلاً:

۱۔ حبش کے باشندے کالے ہوتے ہیں۔

۲۔ پٹھان قوم کے بچے بھی بہادر اور جفاکش ہوتے ہیں۔

۳۔ ایک انگریز بے وقوف ہوتا ہے مگر دو انگریز مل کر دوسروں کو بیوقوف بناتے ہیں۔

(د) جب کسی شخص کا کسی سے دُور کا رشتہ ظاہر کرنا ہو، مثلاً:۔

۱۔ احمد میرا خالہ زاد بھائی ہوتا ہے۔ (یعنی سگی خالہ کا لڑکا نہیں، کسی رشتے کی خالہ کا۔)

۲۔ محمود، نادر کا ماموں ہوتا تھا، (یعنی، سگا ماموں نہیں۔)

[ان مثالوں میں ہوتا کے بجائے لگتا بھی بولتے ہیں، یعنی: "احمد میرا خالہ زاد بھائی لگتا ہے" وغیرہ۔]

ان چاروں موقعوں کے علاوہ ہوتا ہے وغیرہ کا استعمال درست نہیں لہٰذا

اُوپر کی مثالیں اس طرح درست ہوں گی :

۱ - میرا بھائی آج کل کراچی سے (یا رہتا ہے)

۲ - یہاں ایک زمانے میں بڑا سا مکان تھا -

۳ - احمد پہلے میرا گہرا دوست تھا -

میں نے محسوس کیا ہے کہ اب ہوتا ہے ، ہوا کرتا تھا وغیرہ کا استعمال کم ہو گیا ہے ، شاید اس کی یہ وجہ ہو کہ یہ استعمال انگریزی محاورے Used tobe کا لفظی ترجمہ ہے ۔ اور اب خود انگریزی میں بھی یہ طرز متروک ہو گیا ہے -

۲۲ - بغیر ، سوائے وغیرہ :

مثالیں :- (۱) حضرت ابراہیمؑ کسی مہمان کو ساتھ بٹھاتے بغیر کھانا نہیں کھاتے ۔ تھے -

۲ - اُس کمرے میں میرے اور سلیم کے بغیر کوئی اور نہ تھا -

پہلے جملے میں بغیر کا استعمال درست ہوا ہے ، کیونکہ بغیر انگریزی لفظ Without کے معنی دیتا ہے ۔ یعنی یہ علاوہ کا ہم معنی نہیں ۔ اس کا دوسرا اُردو مترادف بلا یا بن ہے -

دوسرے جملے میں بغیر غلط استعمال ہوا ہے ۔ یہاں سوا یا علاوہ آنا چاہیے ، جس کا انگریزی مترادف Except ہے -

بغیر ، بلا ، بن (ہندی میں بنا) کے استعمال میں حسبِ ذیل فرق ہے :-

(الف) بلا ہمیشہ اپنے اسم سے پہلے آتا ہے ، جیسے :-

"تم بلا پٹے باز نہ آؤ گے !" (یہاں پٹے بلا بولنا غلط ہے -)

(ب) بن اپنے اسم سے پہلے بھی آتا ہے ، جیسے :-

"مجھ سے بن کہے تم کہاں چلے گئے تھے ؟ "

اور بعد بھی، جیسے :

وہاں جائے بِن کیونکر معلوم ہو سکتا ہے کہ کیا معاملہ تھا ؟ "

ویسے جدید اُردو میں بِن بطور سابقہ (Prefix) لگایا جاتا ہے، جیسے بِن سِلا کپڑا[1]، بِن سری فوج وغیرہ۔

(ج) بغیر ہر طرح کے اِسم کے لیے آتا ہے، جب کہ بِن اور بِلا اسم ذات کے لیے کبھی نہیں آتے۔ اِس کے علاوہ یہ اپنے اسم سے پہلے بھی آتا ہے، اور بعد بھی، جیسے :

۱۔ تمھارے بغیر میں وہاں نہیں جاؤں گا۔

۲۔ بغیر تمھارے، میں وہاں نہیں جاؤں گا۔

مگر بہتر ہے کہ بعد میں لایا جائے۔ ہاں، اگر جملے میں بغیر کا اسمیہ فقرہ طویل ہو جائے تو پہلے لانا بہتر ہے۔ جیسے :۔

"بغیر اپنے والد کی مرضی معلوم ہوئے ہیں یہ کام نہیں کروں گا۔"

۲۳ : اسمائے پیمائش سے پہلے معیّن صفاتِ عددی :

مثالیں :۔ ۱۔ میرا دوست تین مہینوں سے بیمار ہے۔

۲۔ پانچ سالوں کا کارنامہ صرف اتنا ہی ہے۔

۳۔ چھ دنوں تک سارا حال معلوم ہو جائے گا۔

۴۔ ہم نے صرف چار گھنٹوں میں اپنا کام کر لیا۔

۵۔ چھ ہفتوں کی مسافت ہوائی جہاز بائیس گھنٹوں میں طے کر لیتا ہے۔

۶۔ لاہور سے سیالکوٹ کا فاصلہ اکیاسی میلوں کا ہے۔

---

[1] کچھ لوگ غلطی سے "اَن سِلا کپڑا" لکھتے ہیں۔ مگر اُردو روزمرّہ کے اعتبار سے یہ درست نہیں۔

۷ ۔ میں نے یہ نظم سات روپوں میں خریدا۔
۸ ۔ یہ کتاب دو سو صفحوں یعنی سو ورقوں کی ہے۔

اسمائے پیمائش سے ہماری مراد وہ اسماء ہیں جو وقت ، فاصلہ ، وزن یا قیمت بتائیں اور معیّن صفاتِ عددی یہی گنتی کے اعداد ؛ ایک ، دو تین ، چار وغیرہ ہیں۔

اُردو میں اسمائے پیمائش کے ساتھ اگر معیّن صفاتِ عددی آئیں تو اِن اسماء کی جمع مجروری نہیں آتی۔ جمع مجروری وہ جمع ہے جس کے آخر میں "وں" لگتا ہے۔ جیسے مہینوں ، سیروں ، میلوں ، روپوں وغیرہ۔

اِس اصول کی رُو سے اُوپر کے جملے اس طرح صحیح ہوں گے:۔

۱ ۔ میرا دوست تین مہینے سے بیمار ہے۔
۲ ۔ پانچ سال کا کارنامہ صرف اِتنا ہی ہے۔
۳ ۔ چھ دن تک سارا حال معلوم ہو جائے گا۔
۴ ۔ ہم نے صرف چار گھنٹے میں اپنا کام کر لیا۔
۵ ۔ چھ ہفتے کی مسافت ہوائی جہاز بائیس گھنٹے میں طے کر لیتا ہے۔
۶ ۔ لاہور سے سیالکوٹ کا فاصلہ اکیاسی میل کا ہے۔
۷ ۔ مَیں نے یہ نظم سات روپے میں خریدا۔
۸ ۔ یہ کتاب دو سو صفحے یعنی سو ورق کی ہے۔

تنبیہ :۔ اُوپر گزر چکا ہے کہ کئی اور چند کی تعداد بھی معیّن (دو سے نو یا دس تک) ہے۔ لہٰذا یہ دونوں بھی معیّن صفاتِ عددی کے حکم میں آتے ہیں اور اگر یہ بھی اسمائے پیمائش سے پہلے آئیں تو ان کی جمع مجروری نہیں آئے گی ، مثلاً :۔

۱ ۔ میرا دوست کئی مہینوں سے بیمار ہے۔ (یہاں "کئی مہینے" لانا چاہیئے)

ہم نے صرف چند گھنٹوں میں اپنا کام کر لیا (یہاں "چند گھنٹے" درست ہے)
وغیرہ وغیرہ)

اِن صفات کے ساتھ اسماء پیمائش کی جمع مجروری نہ آنے کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ ایسے جملوں میں خود اسمائے پیمائش مقصود نہیں ہوتے بلکہ ان سے مقدار کا پتہ چلتا ہے۔ یعنی

"میرا دوست تین مہینے سے بیمار ہے۔"

کا مطلب در اصل یہ ہے کہ "تین مہینے کی مدّت سے بیمار ہے"۔ اسی طرح "اکیاسی میل" کا مطلب "اکیاسی میل کا فاصلہ" اور "سات روپے" کا مطلب "سات روپے کی قیمت" ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

استثنا: (۱) اگر خاص طور پر اسمائے پیمائش ہی کا اظہار کرنا مقصود ہو تب ان کی جمع مجروری ان صفاتِ عددی کے ساتھ بھی آ سکتی ہے۔ مثلاً:-

۱۔ میرا دوست تین مہینے سے بیمار ہے، اور ان تین مہینوں میں میرا اُس سے ایک دفعہ بھی ملنا نہ ہو سکا۔

۲۔ دیکھنا ان چھ مہینوں میں کیا سے کیا ہو جائے گا۔

۳۔ میں دو برس انگلستان میں رہا، اور ان دو برسوں کا حال میں نے روزنامچے کی صورت میں قلم بند کر لیا

گویا ایسے مواقع پر صفاتِ عددی سے پہلے اِسمِ اشارہ جمع "اِن" یا "اُن" لازماً آتا ہے۔ تبھی اسمائے پیمائش کی جمع مجروری آ سکتی ہے۔

(۲) رات اور صدی وہ اسماء ہیں جن کی جمع مجروری ایسی حالت میں بھی آتی ہے۔ مثلاً:-

۱۔ میں تین راتوں سے نہیں سویا۔
۲۔ مسلمان دنیا پر بارہ صدیوں تک چھائے رہے۔
یہاں "راتوں" اور "صدیوں" لانا درست ہے اگرچہ بہتر یہی ہے، کہ نہ لائے جائیں، یعنی:
۱۔ میں تین رات سے نہیں سویا۔
۲۔ مسلمان دنیا پر بارہ صدی تک چھائے رہے۔
فصیح تر اظہار ہے۔

۲۴۔ دیر:

مثالیں:۔ ۱۔ میں تمھارے بھائی کو دیر سے جانتا ہوں۔
۲۔ علامہ اقبالؒ کی وفات بہت دیر پرانی بات ہے۔
۳۔ یہ عمارت بہت دیر میں بن کر تیار ہوگی۔
۴۔ اب کے دھوبی نے کپڑے بہت دیر میں دیئے۔
۵۔ اس منصوبے کی تکمیل میں دو سال کی دیر ہوگئی۔

پہلے تین جملوں میں دیر کا استعمال "مدت" یا "عرصہ" کے معنوں میں ہوا ہے۔ ان معنوں میں دیر کا استعمال موجودہ اردو میں چند گھنٹے سے زیادہ کے لیے نہیں ہوتا۔ اس لیے ان تینوں جملوں میں "دیر" کے بجائے مدت یا عرصہ آنا چاہیئے۔

البتہ آخری دونوں جملوں میں دیر کا استعمال تاخیر کے معنوں میں ہوا ہے، اور ان معنوں میں دیر کا زمانہ غیر معین ہوتا ہے۔ لہٰذا یہ دونوں جملے صحیح ہیں (اگرچہ ان موقعوں پر بھی لمبی مدت کا ذکر کرنا منظور ہو تو فصحائے اردو دیر کی جگہ تاخیر لانا پسند کریں گے۔)

۲۵۔ کرنے والا کام، وغیرہ :

مثالیں :۔ ا۔ کپڑے کی تجارت تم بھی شروع کر دو۔ یہ کام کرنے والا ہے۔

۲۔ اس سرکس کمپنی کا تماشا دیکھنے والا ہے۔

اس طرح کے جملوں میں والا کا استعمال صحیح نہیں، کیونکہ والا کا لاحقہ لگانے سے اسم فاعل بنتا ہے، مگر یہاں یہ "لائق" کے معنوں میں آیا ہے: یعنی، پہلے جملے میں اس کا مطلب ہے کہ "یہ کام کرنے کے لائق ہے۔" اور دوسرے میں یہ کہ "تماشا دیکھنے کے لائق ہے۔" اس لیے ان کی جگہ صرف کا آنا چاہیے، یعنی

ا۔ .... یہ کام کرنے کا ہے،

۲۔ .... تماشا دیکھنے کا ہے۔

اقبالؒ کا مصرع ہے: ؎

"ہے دیکھنے کی چیز، اسے بار بار دیکھ" (یعنی "دیکھنے کے لائق")

مختصراً یہ کہ والا صرف اُس لفظ میں لگتا ہے جو کسی متعدی فعل کا فاعل ہو۔

۲۶۔ جمع مؤنث متکلم :

مثالیں :۔ ا۔ ہم کل وہاں گئی تھیں۔

۲۔ ہم اِس وقت ضروری کام کر رہی ہیں۔

۳۔ ہم تمھیں جلد ہی ساری بات بتا دیں گی۔

اُردو میں جمع متکلم کے لیے مذکر اور مؤنث کے صیغے الگ الگ نہیں آتے۔ اس لیے یہ تینوں جملے غلط ہیں۔ یہ اس طرح صحیح ہوں گے:۔

ا۔ ہم کل وہاں گئے تھے۔

۲۔ ہم اس وقت ضروری کام کر رہے ہیں۔
۳۔ ہم تمھیں جلد ہی ساری بات بتا دیں گے۔

مطلب یہ ہے کہ فعل کا زمانہ خواہ کوئی ہو، اور جمع متکلّم (جس کا فاعل ہمیشہ "ہم" ہوتا ہے) مذکر یا مونث، دونوں کے لیے ایک ہی صیغہ (مذکر) آئے گا۔ یہ اصول قواعد کی تمام کتابوں میں درج ہوتا ہے، پھر بھی تعجب ہے کہ بعض لوگ اس کی پیروی نہیں کرتے۔

البتہ اگر "ہم" (فاعل) کا کوئی بدل بھی جملے میں ہو تو فعل کا صیغہ مؤنث بھی آسکتا ہے۔ مثلاً:-

۱۔ ہم عورتیں وہاں گئی تھیں۔
۲۔ ہم لڑکیاں تمھیں خوب جانتی ہیں۔

یہ دونوں جملے درست ہیں، کیونکہ ان میں فاعل "ہم" نہیں رہا، بلکہ اس کا بدل "عورتیں" یا "لڑکیاں" فاعل ہے اور اس طرح یہ صیغہ جمع متکلّم کے بجائے جمع غائب ہو گیا۔

۲۷ مت کا استعمال:

اُردو میں مت صرف اَمر کو نہی بنانے کے لیے آتا ہے۔ اَمر کسی کام کے حکم دینے (یا التجا کرنے) کو کہتے ہیں، اور نہی کسی کام کے منع کرنے کو اور ان دونوں صیغوں کا استعمال ہمیشہ حاضر (مخاطب) سے ہوتا ہے، متکلّم یا غائب سے کبھی نہیں۔ اَمر کی یہ صورتیں ہیں:-

۱۔ (تُو) ایسا کر۔
۲۔ (تم) ایسا کرو۔

۳۔ (آپ) ایسا کیجئے۔
۴۔ (آپ یا تم) ایسا کرنا۔
۵۔ (تم یا تو) ایسا کیجیو۔

ان پانچ فعلوں پر مت لگا کر ان کو نہی بنایا جا سکتا ہے، یعنی :۔

۱۔ مت کر۔
۲۔ مت کرو۔
۳۔ مت کیجئے۔
۴۔ مت کرنا۔
۵۔ مت کیجیو۔

ان پانچ صورتوں کے علاوہ مت کہیں نہیں آتا۔ بعض صورتیں ایسی بھی ہیں کہ بظاہر امر معلوم ہوتی ہیں، یعنی :

۱۔ آپ ایسا کریں۔
۲۔ آپ ایسا کیجئے گا۔
۳۔ تم ایسا کرتے۔
۴۔ تُو ایسا کرتا۔

لیکن یہ چاروں صورتیں، حکم یا التجا نہیں، تمنا ظاہر کرتی ہیں۔ اس لیے ان کے فعلوں پر مت نہیں لگایا جا سکتا۔ مثلاً یہ جملے غلط ہیں :۔

۱۔ اپنے جسم کا کوئی حصہ کھڑکی سے باہر مت نکالیں۔
۲۔ دیکھیئے، کہیں زنانہ ڈبے میں مت چلے جائیے گا۔
۳۔ جب تمہیں نہیں بلایا گیا تھا تو مت جاتے۔
۴۔ تُو نے روٹی مت کھائی ہوتی۔

ان چاروں جملوں میں مَت کے بجائے نہ لانا چاہیئے۔

فائدہ: بعض فصحائے اہلِ زبان بخصوصاً اہلِ لکھنؤ، مَت کو بالکل غیر فصیح سمجھتے ہیں اور ہر حال میں اس کی جگہ نہ بولتے اور لکھتے ہیں لیکن میری دانست میں مت ہرگز غیر فصیح نہیں ہے۔

۲۸۔ تاہنوز:

"تاہنوز" بمعنی "ابھی تک" غلط ہے۔ فارسی میں بھی صرف "ہنوز" کے معنی "ابھی تک" ہیں، اور اُردو میں بھی۔ لہٰذا مثلاً اس جملے میں:۔

"اہلِ پاکستان کو تاہنوز اپنی جداگانہ قومیت کا احساس نہیں ہوا ہے۔"

"تاہنوز" کی جگہ صرف "ہنوز" کافی ہے۔ بعض لوگ "تاحال" بھی لکھتے ہیں۔ یہ اگرچہ درست ہے، لیکن اس ثقیل فارسی لفظ (ہنوز، تاحال) کی جگہ سیدھا سادھا اُردو "ابھی تک" استعمال کرنا چاہیے۔

۲۹۔ بمع:

حیرت ہوتی ہے کہ یہ لفظ کب سے اور کس طرح اہلِ پنجاب میں رائج ہو گیا، حالانکہ یہ مضحکہ خیز حد تک غلط ہے۔ بہ کے وہی معنی ہیں (ساتھ) جو مع کے ہیں۔ (پہلا فارسی ہے دوسرا عربی) لہٰذا دونوں ملا کر بولنا قواعد و روزمرہ بلکہ عقلِ سلیم کے خلاف بھی ہے۔ صرف مع بولنا یا لکھنا کافی ہے۔

تنبیہ: بعض لوگ مع کا املا معہ لکھتے ہیں۔ یہ بھی غلط ہے۔ مع کے آخر میں ہ نہیں ہے۔

۳۰۔ جملہ صفاتیہ کے بعد حرفِ جار:

مثالیں: ۱۔ وزیرِ اعظم پاکستان، جو آج کل بلوچستان گئے ہوئے ہیں، نے جلسۂ عام میں تقریر کی۔

۲۔ ملتان، جہاں سخت گرمی پڑتی ہے، سے لُو لگنے کی بہت خبریں آرہی ہیں۔
۳۔ ۱۹۴۷ء، جب تقسیم ہند ہوئی تھی، کے خونی ہنگامے رہتی دنیا تک یادگار رہیں گے۔

جو، جس، جن، جنھوں سے شروع ہونے والے جملے صفاتیہ کہلاتے ہیں اور جب، جہاں سے شروع ہونے والے جملے ظرفیہ (پہلی کسی کے جملے کسی اسم کی صفت بیان کرتے ہیں اور دوسری قسم کے ظرف یعنی جگہ یا وقت بتاتے ہیں۔) ان دونوں قسموں کے جملوں کے بعد حرفِ جار (سے، نے، کو، سے، تک وغیرہ) لانا درست نہیں۔ چنانچہ اُوپر کی مثالوں کی صحیح صورت یہ ہوگی:۔

۱۔ وزیراعظم پاکستان نے، جو آج کل ....
۲۔ ملتان سے، جہاں سخت گرمی ....
۳۔ ۱۹۴۷ء کے، جب تقسیم ہند ....

اس کی وجہ یہ ہے کہ حرفِ جار کو اپنے مجرور کے بالکل قریب ہونا چاہیے۔ جار اور مجرور کے بیچ میں پورا جملہ حائل ہوجانا غلطی ہے۔ البتہ جملے کے بجائے لفظ یا فقرہ دونوں کے درمیان لایا جا سکتا ہے (جملے میں فعل ہوتا ہے، فقرے میں نہیں ہوتا) مثلاً :۔

۱۔ وزیراعظم پاکستان، یعنی جناب لیاقت علی خان، نے جلسۂ عام میں تقریر کی۔
۲۔ ملتان، گرمی کے لیے مشہور شہر، سے لُو لگنے کی خبریں آرہی ہیں۔

---

[1] عام طور پر قواعد نویس حضرات نے کو علامتِ فاعل لکھتے ہیں۔ مگر میری تحقیق کے مطابق یہ صرف حرفِ جار ہے۔ اس کی تفصیلی بحث میں عرصہ ہوا ایک مضمون (مطبوعہ رسالہ اُردو کراچی، جنوری ۱۹۵۲ء) میں کرچکا ہوں۔

جن جملوں میں کا ، کے ، کی آئیں، اُن میں بعض دفعہ اس قاعدے کی پابندی کرنے سے عبارت بدنُما ہو جاتی ہے۔ مثلاً اُوپر کی اصلاح شدہ مثال میں "۱۹۴۷ء" کے فوراً بعد کے لایا گیا ہے اور اس کے بعد جملہ ظرفیہ شروع ہو گیا ہے، اور اس کے بھی بعد جُملے کا باقی حصّہ آیا ہے۔ مگر یہ اچھا نہیں معلوم ہوتا، اس کی وجہ یہ ہے کہ کا ، کی ، کے بیک وقت حروفِ جار بھی ہیں اور حروفِ اضافت بھی۔ حروفِ جار کی حیثیت میں اُنھیں اپنے مجرور سے مُتّصل آنا چاہیئے ، اور حروفِ اضافت کی حیثیت میں اُنھیں اپنے مُضاف سے دُور نہیں رکھا جا سکتا۔ ایسی صورت میں بہتر تو یہی ہوگا کہ اُنھیں مجرور کے قریب رکھا جائے ، خواہ ان کا مضاف دُور جا پڑے۔ مگر بعض موقعوں پر اس طرح کام نہیں چلتا ، مثلاً :۔

"احمد کا ، جو آج کل بیمار ہے ، نوکر چھٹی پر ہے۔"

جُملے کی یہ ساخت صریحاً بدنُما ہے۔ مگر اسے اس طرح نہیں لکھا جا سکتا :۔

"احمد کا نوکر ، جو آج کل بیمار ہے ، چھٹی پر ہے۔"

کیونکہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ احمد نہیں بلکہ احمد کا نوکر بیمار ہے۔ اس کی یہ شکل بھی غلط ہے :۔

"احمد ، جس کا نوکر چھٹی پر ہے ، آج کل بیمار ہے۔"

کیونکہ اس میں اصل خبر احمد کا بیمار ہونا ہے ، حالانکہ اصل خبر نوکر کا چھٹی پر ہونا ہے۔ پس ایسی صورت میں جملہ اس طرح سب سے بہتر اور صحیح ہوگا :۔

"احمد ، جو آج کل بیمار ہے اُس کا نوکر چھٹی پر ہے۔"

یعنی ایسے موقعے پر ایک لفظ اُس (یا جمع کی صورت میں اُن) بڑھانا پڑے گا۔

۳۱۔ حیرانگی ، ناراضگی ، وغیرہ :۔ فارسی قاعدہ یہ ہے کہ اسمِ صفت سے

حاصل مصدر بنانے کے لیے آخر میں ی لگاتے ہیں، بشرطیکہ اسم صفت کا آخری حرف کا نہ ہو اور اگر آخری حرف ہ ہو تو اُسے گرا کر گی بناتے ہیں۔ چنانچہ حیران، پریشان، ناراض، دانا، بینا وغیرہ جتنے اسمائے صفات ہ پر ختم نہیں ہوتے ان کے حاصل مصدر حیرانی، پریشانی، ناراضی، دانائی، بینائی وغیرہ بنتے ہیں۔ لہٰذا حیرانگی، ناراضگی غلط ہیں۔ (بول چال میں ناراضگی تو اکثر آتا ہے، مگر فصحا لکھتے وقت اسے بھی ناراضی ہی لکھیں گے اور حیرانگی تو اُردو بول چال میں بھی نہیں آتا۔)

البتہ مردانہ، فرزانہ، زندہ، شُستہ، دارفتہ وغیرہ (یعنی ہ پر ختم ہونے والے اسماء) کے حاصل مصدر، مردانگی، فرزانگی، زندگی، شستگی، دارفتگی وغیرہ آتے ہیں۔

صرف ایک لفظ میری نظر میں ایسا ہے، جو اس قاعدے سے مستثنیٰ معلوم ہوتا ہے یعنی کرخت کا حاصل مصدر قاعدے کی رُو سے کرختی بننا چاہیے۔ مگر اس کے بجائے کرختگی لکھا اور بولا جاتا ہے۔ ورنہ اس معاملے میں بعض فصحا، تو اتنے شدید ہیں کہ ادا سے بھی حاصل مصدر ادائگی کے بجائے ادائی بناتے ہیں، حالانکہ ادا اسم صفت نہیں ہے۔

۳۲۔ بے شک :

مثالیں :۔ ۱۔ آپ بے شک کسی سے پوچھ لیجیے میں نے چوری نہیں کی۔

۲۔ آپ بیشک اس کمرے میں تشریف رکھیں۔

ان دونوں جملوں میں بے شک کا استعمال درست نہیں۔ اُردو میں اس لفظ کا استعمال اس کے اصلی معنوں میں ہوتا ہے، یعنی "کوئی شک نہیں"۔ ظاہر ہے کہ ان جملوں میں یہ الفاظ بے معنی ہوں گے۔ کہنے والا اپنی بات میں جو زور پیدا کرنا

چاہتا ہے وہ ان موقعوں پر دوسرے الفاظ سے ہو سکتا ہے، یعنی پہلے جملے میں "چاہے" سے، اور دوسرے میں "شوق سے"؛ یعنی :

۱۔ آپ چاہے کسی سے پوچھ لیجئے ....
۲۔ آپ شوق سے اُس کو پڑھیے ....

البتہ ان جملوں میں بے شک کا استعمال ٹھیک ہے :۔

۱۔ اُردو کی خدمات کے سلسلے میں پنجاب کی خدمات کو بھلا دینا بے شک ناانصافی ہوگی ۔
۲۔ بے شک ہمیں ہر حال میں خداوند تعالےٰ کا شکرگزار ہونا چاہیے ۔

کیونکہ ان میں بے شک اپنے اصلی معنوں میں آیا ہے ۔

۳۳۔ ساتھ، پاس، برابر :

ان تینوں لفظوں کے استعمال میں ذرا ذرا سا فرق ہے، جسے آج کل عموماً نظر انداز کیا جاتا ہے۔ لیکن یہ بات ٹھیک نہیں۔ الفاظ کا صحیح استعمال صحیح زبان کا پہلا اور اہم ترین لازمہ ہے۔ اب ان الفاظ کے فرق کی تفصیل ملاحظہ ہو :۔

(الف) ساتھ کے معنی میں وقت کا عنصر پایا جاتا ہے۔ یعنی جب یہ لفظ بولا جائے تو اس سے حرکت یا تسلسل یا استمرار کے معنی پیدا ہوتے ہیں اور ان تینوں معنوں کا تعلق وقت سے ہوتا ہے۔ مثلاً :۔

۱۔ میرے ساتھ چلو (حرکت)
۲۔ ہم دونوں شریک ساتھ ساتھ کام کرتے ہیں ۔ (تسلسل)
۳۔ یہ لڑکا عمر بھر میرے ساتھ رہا اور اب بھی رہتا ہے ۔ (استمرار)

(ب) پاس کے معنی میں قُربت یا قبضہ پایا جاتا ہے مثلاً :-

۱- میرے پاس آکر بیٹھو (قربت)

۲- تمہاری گھڑی میرے پاس ہے (قبضہ)

اس طرح پاس کے معنوں میں جگہ کا عنصر پایا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ساتھ اور پاس میں ایک اہم فرق یہ بھی ہے کہ پاس ہمیشہ قربت ظاہر کرتا ہے۔ اور ساتھ کبھی قربت ظاہر کرتا ہے اور کبھی نہیں۔ اوپر (الف) کی پہلی اور تیسری مثالوں میں قربت پائی جاتی ہے، مگر دوسری میں نہیں۔ "ساتھ ساتھ کام کرتے ہیں" کا مطلب پاس بیٹھ کر کام کرنا نہیں بلکہ ایک کے کام کا دوسرے کے کام سے مطابقت رکھنا ہے۔ یعنی "ہم ایک دوسرے کے تعاون سے کام کرتے ہیں۔"

(ج) برابر کے معنی میں جگہ کا عنصر بھی ملتا ہے، اور سکون کا بھی۔ اس کے علاوہ اس میں ساتھ سے زیادہ قربت پائی جاتی ہے۔ مثلاً "ساتھ والا کمرا" کہنا غلط ہے۔ اس کے بجائے "برابر والا کمرا" کہنا چاہیے، جس کا مطلب ہے "متّصل کمرہ"

برابر کے ایک اور استعمال میں آگے یا پیچھے نہ ہونا بھی پایا جاتا ہے مثلاً "دوڑ میں ہم دونوں برابر آئے"۔ یعنی ایک دوسرے سے آگے یا پیچھے نہ ہوئے۔

مناسب ہوگا کہ یہاں ایک ہی جملے میں تینوں الفاظ کے استعمال سے معنی کا فرق واضح کر دیا جائے :-

۱- وہ میرے پاس بیٹھا تھا۔

۲- وہ میرے ساتھ بیٹھا تھا۔

۳ ۔ وہ میرے برابر بیٹھا تھا ۔

تینوں جملوں کا مفہوم مختلف ہے۔ پہلے جملے کا مطلب ہے کہ وہ میرے قریب ہی کسی مقام پر آگے یا پیچھے بیٹھا تھا یعنی میرے اور اُس کے درمیان بہت کم فاصلہ تھا۔ تیسرے جملے کا مطلب ہے کہ وہ میرے متصل، یعنی اس طرح بیٹھا تھا کہ نہ مجھ سے کچھ فاصلے پر تھا، نہ آگے نہ پیچھے لیکن دوسرے جملے کا مطلب یہ ہے کہ جس وقت میں بیٹھا تھا اُسی وقت وہ بھی بیٹھ گیا تھا، چاہے مجھ سے فاصلے پر بیٹھا یا آگے پیچھے۔

۳۴ ۔کیا ۔کس قدر :

مثالیں :- (۱) آپ کی مجبوریاں خواہ کیا ہوں، ذرا میری ضرورتوں کا بھی تو خیال کیجئے۔

۲ ۔ دشمن خواہ کس قدر ہمدردی جتائے، آخر دشمن ہی ہے ۔

پہلے جملے میں کیا کا استعمال اُردو بول چال کے خلاف ہے۔ اس کی جگہ 'کچھ ہی' یا 'کچھ بھی' لانا چاہیے خواہ لانے کی ضرورت نہیں، یعنی :

"آپ کی مجبوریاں کچھ ہی (یا کچھ بھی) ہوں......"

دوسرے جملے میں کس قدر کے بجائے کتنی ہی لانا چاہیے (اس میں بھی خواہ کا استعمال زائد ہے) یعنی :

"دشمن کتنی ہی ہمدردی جتائے......"

۳۵ : مرکب افعال کے مستقبل قریب :

مرکب افعال وہ ہیں جو دو فعلوں سے مل کر بنتے ہیں ۔مثلاً آنا مفرد فعل ہے۔

اس میں ایک اور فعل لگا کر معنی کچھ وسیع کر لیا جاتا ہے : جیسے ، آجانا ، آپہنچنا ، آدھمکنا ، آمرنا وغیرہ۔

مستقبل قریب کا بیان کسی قواعد میں نظر سے نہ گزرا ، لیکن اُردو میں یہ صیغہ بھی مستعمل ہے۔ اور مختلف طریقوں سے آتا ہے مثلاً "میں کروں گا" مستقبل مطلق ہے ، لیکن "میں کرنے جا رہا ہوں" مستقبل قریب ہے ، کیونکہ اس میں قریبی آئندہ زمانے میں کام کا ہونا بتایا جا رہا ہے۔ یعنی ، اس کے معنی ہیں : "میں عنقریب یہ کام کرنے والا ہوں"۔

اب یہ مثالیں دیکھیے :۔

۱۔ میں کتاب میز پر رکھ دیتا ہوں۔
۲۔ میرا نوکر ابھی آپ کے پاس پہنچ جاتا ہے۔
۳۔ آپ کی ڈاک ابھی آجاتی ہے۔
۴۔ ہم ابھی کھانا کھا لیتے ہیں۔

بظاہر یہ جملے مستقبل قریب کے صیغے میں ہیں ، یعنی کہنے والا ان کے کام کا قریبی آئندہ زمانے میں ہونا بتانا چاہتا ہے لیکن دراصل یہ سب صیغے حال استمراری کے ہیں ، جن سے عادت ظاہر ہوتی ہے۔ پہلے جملے کا مطلب ہوگا کہ میں ہمیشہ میز پر کتاب رکھ دینے کا عادی ہوں۔ اسی طرح باقی جملوں سے بھی عادت کا اظہار ہوتا ہے۔ ان کے بجائے اُردو میں مرکب افعال کے مستقبل قریب بنانے کے طریقے اور ہیں ، جو آگے آتے ہیں۔ ان جملوں میں مستقبل قریب کی صحیح صورتیں یہ ہوں گی :۔

۱۔ میں کتاب میز پر رکھے دیتا ہوں۔
۲۔ میرا نوکر ابھی آپ کے پاس پہنچا جاتا ہے۔

۳ - آپ کی ڈاک ابھی آئی جاتی ہے ۔
۴ - ہم ابھی کھانا کھائے لیتے ہیں ۔
مرکب افعال کے مستقبل قریب بنانے کے دو قاعدے ہیں ۔
۱ - اگر مرکب فعل متعدی ہے تو اس کے پہلے جزو (یعنی پہلے فعل) میں یائے مجہول لگائی جاتی ہے ، جیسے اُوپر کی مثالوں میں پہلے اور چوتھے جملے سے ظاہر ہے ۔ (رکھ دینا سے رکھے دیتا ہوں ، کھا لینے سے کھائے لیتے ہیں ۔)
۲ - اگر مرکب فعل لازمی ہے تو اُس کا پہلا جزو فاعل کے تابع ہو کر شکلیں بدلے گا ۔ یعنی اگر فاعل واحد مذکر ہے تو اس فعل میں الف بڑھایا جائے گا ؛ اگر فاعل جمع مذکر ہے تو یائے مجہول کا اضافہ ہو گا ، اور اگر فاعل مؤنث (واحد یا جمع) ہے تو یائے معروف زیادہ کی جائے گی ۔ مثلاً ، آجانا فعل مرکب لازمی ہے ۔ اس کے مستقبل قریب کی تین صورتیں یُوں ہوں گی :-
۱ - وہ ابھی آیا[1] جاتا ہے ۔ (فاعل : واحد مذکر)
۲ - وہ ابھی آئے جاتے ہیں (" : جمع مذکر)
۳ - وہ ابھی آئی جاتی ہے (" : واحد مونث)
۴ - وہ ابھی آئی جاتی ہیں (" : جمع مونث)

[1] اس فعل میں صرف الف نہیں بلکہ یا بڑھایا گیا ہے ، کیونکہ قواعد کی رُو سے دو الف ایک ساتھ نہیں آتے ۔ اگر اس کی جگہ کوئی دوسرا فعلِ لازم ہوتا مثلاً بیٹھ ، لیٹ وغیرہ تو صرف الف ہی لگتا ۔]

گویا متعدی افعال مرکب میں فعل کا پہلا جزو فاعل بدلنے سے نہیں بدلتا ،

بلکہ اس میں بہر حال صرف یائے مجہول بڑھائی جاتی ہے۔ مگر لازمی افعال کا پہلا جز فاعل بدلنے سے بدل جاتا ہے۔

تنبیہ:۔ یاد رہے کہ یہ طریقہ صرف مرکب افعال کے لیے ہے۔ مفرد افعال کا مستقبل قریب وہی ہوتا ہے جو حال استمراری ہوتا ہے۔ جیسے "میں جاتا ہوں" کا مطلب یہ بھی ہے کہ "میں جایا کرتا ہوں" اور یہ بھی کہ "میں اب جلد ہی جانے والا ہوں"۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دہلی میں مرکب افعال کے مستقبل قریب کی جداگانہ شکل رائج نہ تھی اور اب بھی وہاں کے لوگ اس کا بہت کم موقعوں پر استعمال کرتے ہیں مگر اہل لکھنؤ بڑی پابندی کے ساتھ اس امتیاز کو قائم رکھتے ہیں۔

۳۶۔ کرنے لگا ہوں:

مثال: "میں تمہیں اب اپنا قصہ سنانے لگا ہوں۔"

اس جملے میں کہنے والے کی مراد یہ ہے کہ وہ مستقبل قریب میں اپنا قصہ سنائے گا۔ لیکن "سنانے لگا ہوں" اردو میں ان معنوں میں نہیں بولا جاتا۔ کسی کام کا "کرنے لگنا" کسی معمول یا عادت شروع کر دینے کے لیے آتا ہے۔ مثلاً:

۱۔ ہم سیر کو باغ میں جانے لگے ہیں۔ (معمول کا آغاز)

۲۔ تم بھی اب پان کھانے لگے ہو۔ (عادت کا آغاز)

یا کسی بات کی مشق ہو جانے کے لیے بولا جاتا ہے۔ جیسے:

"اب تو ہمارا نیا نوکر اچھا کھانا پکانے لگا ہے۔" (یعنی اسے اچھا کھانا پکانے کی مشق ہو گئی ہے)

لیکن مستقبل قریب کے لیے "کرنے لگنا" استعمال کرنا ٹھیک نہیں۔ اُوپر کی

مثال میں اس جملے کے بجائے ذیل کا کوئی جملہ صحیح ہوگا۔

۱۔ میں تمہیں اب اپنا قصہ سنانے والا ہوں۔
۲۔ 〃 〃 〃 〃 〃 سنایا چاہتا ہوں۔
۳۔ 〃 〃 〃 〃 〃 سنانے کو ہوں۔
۴۔ 〃 〃 〃 〃 〃 سنانے جا رہا ہوں۔

۳۷۔ بُرا منانا :

"اردو میں "بُرا منانا" کوئی محاورہ نہیں۔ اس کے بدلے بُرا ماننا" بولتے ہیں۔ اقبال بھی کہتے ہیں : مصرع

سچ کہہ دوں، اے برہمن، اگر تو بُرا نہ مانے

۳۸ : اگر تو.....

مثال : اگر تو میں آج ٹھیرا تو پھر آپ کا کام ضرور ہو جائے گا۔
اگر کے بعد تو لگانا معلوم اہل پنجاب کے روزمرہ میں کس طرح آ گیا، حالانکہ یہ صریحاً غلط ہے۔ "اگر جملہ شرطیہ پر لگتا ہے اور تو اس کی جزا پر، پھر دونوں کا ایک ساتھ استعمال کس طرح صحیح ہو سکتا ہے؟ لہٰذا اوپر کی مثال میں اگر کے فوراً بعد والا تو نہ صرف زائد بلکہ غلط ہے۔

۳۹۔ ممکن ہو سکنا :

مثال : آپ سے ممکن ہو سکے تو میرا کام کر دیجیے۔
ممکن کے معنی میں خود ہی "سکنے" کا مفہوم شامل ہے، لہٰذا "ممکن ہو سکنا"

ایک لغو بات ہو گی۔ یہ جملہ اس طرح درست ہو گا :۔

۱۔ آپ سے ہو سکے تو میرا کام کر دیجئے۔ یا

۲۔ آپ سے ممکن ہو تو میرا کام کر دیجئے۔

۴۰۔ کرتا کرتا، وغیرہ :

مثالیں : ۱۔ میں چلتا چلتا آخر اس کے گھر پہنچ ہی گیا۔

۲۔ میری بات سن کر وہ کام کرتا کرتا رُک گیا۔

حالیہ تمام اگر مکرر آئے تو آخری الف کے بجائے اس میں ے لگ جاتی ہے اور خواہ جملے کا فاعل واحد ہو، جمع ہو، مذکر ہو یا مونث ہو۔ اس کی شکل نہیں بدلتی۔ چنانچہ اوپر کی مثالوں میں "چلتا چلتا" کی جگہ "چلتے چلتے" اور "کرتا کرتا" کی جگہ "کرتے کرتے" آئے گا۔

البتہ اگر دو حالیہ تمام ایک ساتھ آئیں تو اُن کی شکلیں فاعل کے ساتھ ساتھ بدل جاتی ہیں۔ مثلاً :۔

۱۔ میں گرتا پڑتا اُس کے گھر پہنچ ہی گیا۔ (واحد مذکر)

۲۔ ہم گرتے پڑتے " " " گئے۔ (جمع مذکر)

۳۔ وہ (عورت یا عورتیں) گرتی پڑتی اُس کے گھر پہنچ گئی /گئیں۔ (واحد/جمع مونث)

۴۱۔ نہ معلوم، نامعلوم :

مثالیں :۔ (۱) نامعلوم مجھ سے شریف صاحب کیوں ناراض ہیں۔

۲۔ نہ معلوم افراد نے سادہ لوح دیہاتی کو چکمہ دے کر لوٹ لیا۔

نامعلوم اسم صفت ہے، جو موصوف کے لیے آتا ہے، لہٰذا اس کا استعمال دوسرے جملے میں درست ہوگا (یعنی: "نامعلوم افراد نے......") اور نہ معلوم اسم تمیز ہے، جو فعل یا کسی دوسرے تمیز سے تعلق رکھتا ہے، لہٰذا اسے پہلے جملے میں لانا درست ہوگا (یعنی: نہ معلوم مجھ سے......")

۴۲۔ مہینے کی تاریخیں :

مثالیں :- ۱۔ آج مارچ کی پانچ تاریخ ہے۔

۲۔ یہاں ہر ماہ کی سات تاریخ کو تنخواہ دی جاتی ہے۔

مہینے کی تاریخوں کو اس طرح استعمال کرنے کی غلطی اتنی عام ہو گئی ہے کہ کسی کا دھیان بھی اس طرف نہیں جاتا۔ اوپر کے جملوں کی صحیح شکلیں یہ ہوں گی :-

۱۔ آج مارچ کی پانچویں (تاریخ) ہے۔

۲۔ یہاں ہر ماہ کی ساتویں (تاریخ) کو تنخواہ دی جاتی ہے۔

یعنی تاریخوں کا عدد سالم لکھنے یا بولنے کے بجائے اُس میں "ویں" بڑھانا ضروری ہے۔ اس کے علاوہ لفظ "تاریخ" لانے کی ضرورت نہیں۔ پہلے جملے میں "پانچویں تاریخ" کے بجائے صرف "پانچویں" اور دوسرے جملے میں "ساتویں تاریخ" کی جگہ صرف "ساتویں" کافی ہے۔

لطف یہ ہے کہ مہینے کی پہلی تاریخ کو کوئی بھی "ایک" نہیں بولتا یا لکھتا۔ مثلاً: "آج مارچ کی ایک تاریخ ہے" کو سب غلط قرار دیں گے۔ پھر جب ایسے موقعوں پر "ایک" کے بجائے "پہلی" بولا جاتا ہے تو اور تمام تاریخوں کو بھی اسی طرح کیوں نہ بولا جائے ؟"

البتہ، اگر مہینہ تاریخ کے بعد میں لایا جائے تو تاریخ کا سالم عدد لکھنا درست ہے۔ مثلاً :-

" آج پانچ مارچ ہے "

" یہ واقعہ سات ماہِ فروری کو رُونما ہوا "

اِن جملوں میں پانچ اور سات کا استعمال درست ہے۔

۴۳۔ جنابہ، بھاوجہ، فوتیدگی :

یہ تینوں الفاظ قطعاً غلط ہیں۔ جناب مونث کے لیے بھی استعمال ہو سکتا ہے، اور چونکہ یہ فارسی لفظ ہے اس لیے اس میں عربی طریقے پر ۃ لگا کر اس کو مونث نہیں بنایا جا سکتا۔ بھاوج (ہندی) بھائی کی بیوی ہی کو کہتے ہیں، اس لیے یہ خود ہی مونث ہے، اس کو مونث بنانے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ فوتیدگی کے بجائے فوت کا حاصل مصدر عربی طریقے پر وفات ہے۔ لہٰذا وفات صحیح ہے، اسے خواہ مخواہ فارسی طریقے پر فوتیدگی بنانا لغو بات ہے۔

۴۴۔ سیدھا سادا :

یہ دو لفظوں سے مرکّب فقرہ ہے جس میں دوسرا لفظ پہلے لفظ کا تابع مہمل ہے نہ کہ کوئی مستقل الگ لفظ۔ اس لیے اس کا اِملا " سادھا " ہونا چاہیے، یعنی یہ ترکیب اِس طرح صحیح ہوگی : " سیدھا سادھا " اس کی جمع کا اِملا " سیدھے سادھے " اور مونث کا اِملا " سیدھی سادھی " ہے۔ " سادا " کوئی لفظ نہیں۔ اور اگر ہے بھی تو اس کا اِملا " سادہ " (آخر میں ہ) ہوگا۔ مگر اس کا اُدھ

کی مثال سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

۴۵۔ بعض الفاظ کے غلط املا۔

(۱) (الف) اسلام علیکم

(ب) اسلام وعلیکم

(ج) السلام وعلیکم

اس عام لفظ کے لکھے جانے والے یہ تینوں املا غلط ہیں، اور معلوم کیوں اور کیسے یہ غلطی رائج ہو کر اتنی عام ہو گئی۔

اس کا صحیح اِملا ہے: "السّلامُ علیکم" (عربی رسم الخط میں اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ)

۲۔ مروّت، مذمّت، محبّت۔

اِن تینوں لفظوں کے پہلے حرف پر بالعموم پیش لگا دیا جاتا ہے، حالانکہ یہ بالکل غلط ہے (مُروّت، مُذمّت مُحبّت کے بجائے) مَروّت، مَذمّت مَحبّت صحیح اِملا اور تلفّظ ہے۔

۳۔ بچّت، پچّاس۔

ان دونوں لفظوں کی چ پر زبردستی تشدید لگا دی جاتی ہے، اور یہ بھی غلط ہے۔ بچَت، پچَاس صحیح اِملا ہے۔

۴۔ لذیز۔

اس لفظ میں دونوں جگہ ذ ہے۔ یعنی صحیح املا "لذیذ" ہے۔

۵۔ والبطہ۔ اس کا املا ط سے نہیں، ت سے "وابستہ" ہے۔

۶۔ خوامخواہ۔ یہ

یہ لفظ دراصل "خواہ مخواہ" ہے، جس کے معنی "چاہو یا نہ چاہو"۔

۷۔ اَتم۔ یہ لفظ بالعموم "اَتَمّ" لکھا جاتا ہے، حالانکہ صحیح لفظ "اُتم" ہے۔

اور یہ عربی لفظ ہے جس کے معنی ہیں مکمل، پورا پورا۔ اس کے برخلاف "اُتم" سنسکرت لفظ ہے، اور اس کے معنی ہیں بلند ترین، سب سے اُونچا۔ لہٰذا اس طرح کے جملے ہیں:

"زید کی شاعری میں جمالیاتی قدریں بدرجۂ اُتم پائی جاتی ہیں۔"

آپ خود غور کیجئے کہ یہ لفظ "اَتم" ہی ہو سکتا ہے۔ دوسرا لفظ "اُتم" یہاں معنی کے علاوہ اس اعتبار سے بھی غلط ہوگا کہ فارسی ترکیب میں ہندی یا سنسکرت لفظ نہیں لایا جا سکتا۔

۸۔ انیس، حسین۔

ان دونوں لفظوں کو بھی غلطی سے "اُنیس" اور "حُسین" لکھا جاتا ہے حالانکہ ان کے پہلے حرف پر زبر (اَنیس، حَسین) ہے۔ البتہ "حُسَین" ایک بالکل مختلف لفظ ہے اور اُس کے دوسرے حرف (س) پر بھی زبر ہے۔ جب کہ "حَسِین" (بمعنی خوبصورت) کے سین پر زیر ہے۔

۹۔ کہکشاں، خزاں، شعاع کی جمع۔

ان تینوں لفظوں کی جمع کا املا بھی غلط لکھا جاتا ہے؛ یعنی کہکشائیں، (کہکشاؤں)، خزائیں (خزاؤں) اور شعائیں (شعاؤں)۔ ان کا صحیح املا یہ ہے: "کہکشانیں (کہکشانوں)، خزانیں (خزانوں) اور شعاعیں (شعاعوں)" پہلے دونوں لفظ فارسی ہیں، اور ان کے آخر میں نون ہے، جسے ہر حال میں ظاہر ہونا چاہیے۔ تیسرا لفظ عربی ہے، اور اس کا آخری حرف عین بھی برقرار رہنا چاہیے۔

۱۰ خاصہ، خاصا۔

پہلے لفظ کے ص پر تشدید ہے (خاصّہ) اور اس کے معنی ہیں خصوصیت، جبکہ دوسرے لفظ میں تشدید نہیں ہے اور اس کے معنی ہیں

بہت ، بڑی حد تک ۔ لیکن بعض لوگ ایک کی جگہ دوسرا استعمال کر جاتے ہیں۔
ذیل کی مثال دیکھیے :-

(۱) ہنسنا انسان کا خاصّہ ہے۔
(۲) تمہارا مکان خاصا آرام دہ ہے۔

پہلے جملے میں خاصّہ کے معنی خصوصیت کے ہیں ، اور اس کا یہی املا درست ہے ۔ دوسرے جملے میں خاصا (بغیر تشدید کے) "بہت" یا کافی" کے معنوں میں آیا ہے ، اور اس کا املا یہی ہے ۔ پہلے جملے میں خاصا اور دوسرے جملے میں خاصّہ لکھنا غلطی ہوگی ۔

فصلِ دوم

خلافِ محاورہ و روزمرہ

۱۔ کو (کہنا، پوچھنا، ملنا):

مثالیں :۔ (۱) میں نے اس کو کہا: "یہاں سے چلے جاؤ"
۲۔ میں نے اُس کو پوچھا کہ اس کا بھائی کہاں ہے اور کیا کرتا ہے۔
۳۔ میں آپ کو ملنے کا بڑا خواہشمند تھا۔

یہ تینوں فعل (کہنا، پوچھنا، ملنا) دو طرح کے حروفِ جار کے ساتھ دو مختلف معنی دیتے ہیں۔

(الف) کہنا کے ساتھ کو لانا پُرانی اُردو میں تو ملتا ہے، بلکہ دہلوی شعرا کے ہاں تو غالبؔ تک کے زمانے میں کبھی کبھی شعر میں اس کا استعمال مِل جاتا ہے جیسا کہ غالبؔ کا ایک شعر ہے ؎

زہرِ غم کر چکا تھا میرا کام
تجھ کو کس نے کہا کہ ہو بدنام

لیکن دہلی میں بھی اسی زمانے سے، اور لکھنؤ میں اس سے بھی پہلے سے، کو کا یہ استعمال زبان سے خارج ہوتا چلا گیا اور اس کی جگہ سے بولا جانے لگا۔ چنانچہ اب ایسے موقعوں پر سے درست ہے۔ چنانچہ غالبؔ کا یہ مصرع اگر آج

کی زبان میں لکھا جائے تو یوں درست ہوگا :

تجھ سے کس نے کہا کہ ہو بد نام

اور اسی طرح اُوپر کی پہلی مثال میں بھی جُملہ یوں ہونا چاہیے : "میں نے اُس سے کہا " یہاں سے چلے جاؤ "

کہنا کے ساتھ کو لانے سے معنی کچھ اور ہی ہو جاتے ہیں۔ یہ جُملے دیکھیے :-

۱۔ مَیں نے اُس سے کہا : " یہاں سے چلے جاؤ "

۲۔ مَیں نے اُس سے کہا : " آج خوب سردی ہے "

۳۔ مَیں نے اُس کو خوب بُرا بھلا کہا۔

۴۔ مَیں نے اُس کو بے وقوف کہا تم کو نہیں کہا۔

پہلے جُملے میں کہنے والا ایک شخص کو ایک حکم دے رہا ہے ، اور دوسرے جملے میں ایک خبر دے رہا ہے۔ اس لیے دونوں جگہ سے آیا ہے لیکن تیسرے اور چوتھے جملے میں کہنے والا اُس غائب شخص کے بارے میں ایک اطلاع دے رہا ہے لہٰذا یہاں کو استعمال ہوا۔

بالفاظ دیگر ، جب کہنا فعل کا مفعول اوّل کوئی شخصیت (ذی رُوح) ہو تو اس فعل کے لیے سے لانا چاہیے۔ مگر جب اس فعل کا مفعولِ اوّل کوئی غیر ذی رُوح ہو (مثلاً ، اُوپر کے تیسرے جُملے میں " بُرا بھلا " اور چوتھے جُملے میں اسمِ صفت " بے وقوف ") تو اس فعل کے ساتھ کو کا مطلب " کے بارے میں " ہوتا ہے۔

[یہاں کوئی اعتراض نہ کرے کہ " بے وقوف " ، کوئی انسان ہی ہوتا ہے ، اس لیے یہ غیر ذی رُوح کیسے ہُوا ؟ دراصل یہاں " بے وقوف " ، اسمِ صفت ہے ، اور صفت اپنے موصوف کے بغیر کوئی مُستقل ، جُداگانہ وجود نہیں رکھتی ؛

لہٰذا یہ لفظ بھی غیر ذی رُوح ہی مانا جائے گا]

(ب) فعل پوچھنا بھی متعدی بہ دو مفعول ہے (یعنی ایسا فعل جو اپنے لیے دو مفعول چاہتا ہے) اس کے مفعول اوّل کے لیے "سے" اور مفعولِ ثانی کے لیے (بشرطیکہ وہ کوئی جُملہ نہ ہو) "کو" آتا ہے۔ مثلاً :-

۱۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ اس کا بھائی کہاں ہے اور کیا کرتا ہے۔

۲۔ میں نے اُس سے اُس کے بھائی کو پوچھا کہ کہاں ہے اور کیا کرتا ہے۔

پہلے جُملے میں "پوچھا" کا مفعولِ اوّل "وہ" ہے، لہٰذا "وہ" کے ساتھ "سے" لایا گیا ("وہ" بدل کر "اُس" ہو گیا) اور چونکہ اس کا مفعولِ ثانی ایک جُملہ ہے، یعنی "اس کا بھائی کہاں ہے......" اس لیے اس جملے سے پہلے "کہ" (حرفِ تشریح) لایا گیا۔

دوسرے جملے میں مفعول اوّل "وہ" ہے، جس کے ساتھ "سے" لایا گیا، اور مفعولِ ثانی "اس کا بھائی" ہے، جس کے ساتھ "کو" لایا گیا۔

مختصراً یوں سمجھ لیجے کہ "پوچھنا" کے ساتھ "کو" لانے کا مطلب "کے بارے میں" ہوتا ہے۔ یعنی "میں نے اس کو پوچھا" کے معنی ہوں گے "میں نے اُس کے بارے میں دریافت کیا"۔

ایک وضاحت ان تمام مثالوں میں ایسے جُملے استعمال ہوئے ہیں جن میں "نے" آیا ہے۔ میری تحقیق کی رُو سے ایسے جُملے طورِ مجہول (Passive Voice) میں ہوتے ہیں، جن کا فاعل وہ ہوتا ہے جسے عام قواعد نویس مفعول کہتے ہیں۔ چنانچہ اُوپر کے تمام جملوں میں ان قواعد نویسوں کی رُو سے "میں" فاعل اور "نے" علامتِ فاعل ہے، جو میرے نزدیک غلط ہے۔

مگر چونکہ اس سے بحث کو بے فائدہ طول ہوتا، اس لیے یہاں میں نے عام قاری کو اُلجھانے کے بجائے ان قواعد نویسوں کی پیروی میں اُن اسما کو مفعول ہی ظاہر کیا ہے جو میری رائے میں مفعول نہیں ہیں۔

(ج) ملنا ان دونوں مصدروں سے مختلف ہے۔ اس کے ساتھ کو اور سے کا استعمال معنی میں کتنا بڑا فرق پیدا کر دیتا ہے، اس کے لیے یہ دو جملے دیکھیے:۔

۱۔ وہ مجھ سے ملا۔ He met me

۲۔ وہ مجھ کو ملا۔ I found him

پہلے جملے کا مطلب ہے کہ وہ میرے پاس ملنے کے ارادے سے آیا۔ لیکن دوسرے جملے کا مطلب یہ ہے کہ میرا اس سے اتفاقاً یا قصداً راہ میں آمنا سامنا ہو گیا۔ دونوں جملوں کا فرق زیادہ اچھی طرح ان کا انگریزی میں ترجمہ کرنے سے واضح ہو سکے گا:

۱۔ "وہ مجھ سے ملا" کا ترجمہ =

۲۔ "وہ مجھ کو ملا" " " =

اس طرح صرف ایک حرف جار کے بدلنے سے معنی کہیں کے کہیں پہنچ گئے۔ اس لیے ان چھوٹے چھوٹے اختلافات کو خوب ذہن نشین کرنے اور الفاظ کے انتخاب میں احتیاط برتنے کی ضرورت ہے۔

۲۔ پتہ کرنا نہیں، پتہ نہیں:

اُردو میں "پتہ کرنا" کوئی روزمرہ نہیں۔ اس کے بجائے پتہ لگانا، پتہ چلانا یا معلوم کرنا آتا ہے، مثلاً:۔

۱۔ میں نے بڑی مشکل سے اُس کے گھر کا پتہ لگایا۔
۲۔ ذرا پتہ تو چلاؤ، اُس کے ہاں آج کیا ہو رہا ہے۔
۳۔ ابھی معلوم کرتا ہوں کہ یہاں اتنے لوگ کیوں جمع ہیں۔

تینوں جملوں میں بہت خفیف سا فرق ہے۔ پہلے میں گھر کا پتہ لگانا سے تلاش اور پھر دریافت کا اندازہ ہوتا ہے۔ دوسرے میں پتہ چلانا تحقیق کرنے اور کھوج لگانے کے لیے آیا ہے۔ اور تیسرے میں معلوم کرنا سے مراد فقط اطلاع حاصل کرنا ہے۔

ان تینوں متعدی افعال کی لازم شکلوں (پتہ لگنا، پتہ چلنا، معلوم ہونا) میں بھی یہی فرق ہے۔

پتہ نہیں اُردو روزمرہ کے خلاف تو نہیں البتہ خلافِ فصاحت ضرور ہے۔ اس کے بجائے معلوم نہیں کہنا بہتر ہے (اس کو خلافِ فصاحت استعمالات کی فصل میں لانا چاہیے تھا، مگر پتہ کرنا کی مناسبت کی وجہ سے یہیں درج کر دیا گیا۔)

۳۔ دل کرنا:

اُردو میں دل کرنا بھی کوئی روزمرہ نہیں۔ اس کی جگہ دل چاہنا یا جی چاہنا لانا چاہیے مثلاً:۔

"میرا بڑا دل کرتا ہے کہ آپ سے ملنے آؤں، مگر گھریلو مصروفیتیں پیچھا ہی نہیں چھوڑتیں"

اس جملے میں "بڑا دل کرتا ہے" کے بجائے "بڑا دل (جی) چاہتا ہے" ٹھیک ہے۔

۴۔ کبھی بھی، کسی بھی :

مثالیں :۔ ۱۔ میں نے اس بات کا کبھی بھی چرچا نہ کیا۔
۲۔ میں نے یہ بات کسی بھی شخص سے نہ کہی۔

کبھی اور کسی کے ساتھ بھی لانا نہایت غیر فصیح اور بھونڈا معلوم ہوتا ہے۔ ان دونوں جملوں میں بھی کے بغیر بھی کام چل سکتا ہے۔ عوام کی بول چال میں کبھی بھی تو آتا ہے۔ (بعض ادیب لکھتے بھی ہیں) لیکن اس کے خلافِ فصاحت ہونے پر فصحاء کا اتفاق ہے۔ رہا کسی بھی، تو یہ نہ لکھا جاتا ہے نہ بولا (ہندی تحریر میں اس کا رواج عام ہے، مگر بولتے وہ بھی نہیں)

اگر زور دینے کے لیے کسی کے ساتھ بھی لانا ضروری سمجھا جائے تو ان دونوں کے بیچ میں کم از کم دو لفظ ہونے چاہئیں: ایک تو کسی کا موصوف، دوسرا حرفِ جار۔ چنانچہ اُوپر کا دوسرا جملہ اس طرح صحیح ہے :۔

"میں نے یہ بات کسی شخص سے بھی نہیں کہی"

یہاں کسی کے موصوف شخص اور حرفِ جار سے کے بعد بھی آیا ہے۔

۵۔ قریباً :

قواعد کی رُو سے تو قریباً کا استعمال درست ہے، مگر اس کو بالعموم علماء دین کی زبان اور قلم ہی پر آتے دیکھا گیا ہے، عام اہلِ زبان نہ بولتے ہیں نہ لکھتے ہیں۔ اس کی جگہ تقریباً لانا بہتر ہے۔

خصوصاً اسے مکرّر لانا صرف اہلِ پنجاب ہی میں دیکھا گیا ہے، یعنی، مثلاً :
"مجھے قریباً قریباً دس ہزار کا نفع ہوا"

ایسے موقع پر قریب قریب لانا چاہیے۔

۶۔ یہاں ہی، وہاں ہی:

پرانی اردو میں، خصوصاً اہل لکھنؤ کے ہاں یہاں ہی، وہاں ہی کا استعمال تو ملتا ہے۔ چنانچہ پنڈت رتن ناتھ سرشار نے بھی یہ جا بجا استعمال کیا ہے۔ مگر موجودہ اردو میں ان کی جگہ یہیں، وہیں بولتے لکھتے ہیں۔

۷۔ آرام، مرضی، ڈر آنا۔

مثالیں:۔ ۱۔ مجھے اس دوا سے آرام آگیا۔
۲۔ آپ کی جب مرضی آئے، مجھے بلا لیجئے۔
۳۔ اُس کی صورت دیکھ کر ڈر آتا تھا۔

تینوں جملوں میں آنا کا استعمال خلاف محاورہ ہے۔ پہلے اور دوسرے جملے میں آنا کے بجائے ہونا درست ہے۔ یعنی،
۱۔ مجھے اس دوا سے آرام ہو گیا۔
۲۔ آپ کی جب مرضی ہو، مجھے بلا لیجیے۔
بلکہ "مرضی ہونا" بھی کچھ پسندیدہ استعمال نہیں۔ "آپ کا جب جی چاہے، مجھے بلا لیجئے" بہتر ہوگا۔ تیسرے جملے میں ڈر لگنا درست ہے یعنی "اس صورت کو دیکھ کر ڈر لگتا تھا" یا پھر "خوف آنا" بھی درست ہوگا۔

۸۔ کام (آنا، جانا، وغیرہ)

مثال:۔ میں کل لاہور کام گیا تھا۔

یعنی: کام سے یا کام کو گیا تھا۔ کام کے بعد سے یا کو لانا روزمرّہ کے مطابق ہے، بلکہ بعض دفعہ اس کے نہ ہونے سے بڑی مضحکہ خیز صورت پیدا ہو سکتی ہے۔ مثلاً :۔

"کیا آپ کا بھائی یہاں کام آیا ہے ؟"

کام آنا ایک ایسا محاورہ ہے جس کا مطلب مارا جانا ہے۔ لہٰذا اس جملے کا یہ مطلب بھی نکل سکتا ہے کہ "کیا آپ کا بھائی یہاں مارا گیا ہے ؟"

۹۔ ڈالنا :

مثالیں :۔ ۱۔ شور نہ ڈالو (ظہیر کاشمیری کی ایک آزاد نظم کا مصرع)

۲۔ ممتحن نے اس دفعہ بڑا مشکل پرچہ ڈالا ہے۔

۳۔ ممتحن نے یہ سوال بہت آسان ڈالا ہے۔

۴۔ عربی الفاظ پر اعراب ڈالنا ضروری ہوتا ہے۔

ڈالنا کے یہ سب استعمال غلط ہیں۔ ان جملوں کی صحیح شکلیں یہ ہوں گی :

۱۔ شور نہ مچاؤ (یا شور نہ کرو)

۲۔ ممتحن نے اس دفعہ بڑا مشکل پرچہ بنایا ہے۔

۳۔ ممتحن نے یہ سوال بہت آسان دیا ہے۔

۴۔ عربی الفاظ پر اعراب لگانا ضروری ہوتا ہے۔

۱۰۔ سناؤ، سنائیے :

مثالیں :۔ ۱۔ سناؤ بھئی، آج کل کیسی گزر رہی ہے ؟

۲۔ سنائیے، کیا حال چال ہیں ؟

اُردو میں ایسے موقعوں پر سُناؤ، سُنائیے کے بجائے کہو، کہیئے بولتے ہیں۔
سُنانا کا اگر کوئی مفعول مثلاً خبر سُنانا، قصّہ سُنانا، گانا سُنانا وغیرہ نہ ہو تو
یہ محاورہ بُرے معنے دیتا ہے یعنی صرف سُنانا کا مطلب صلواتیں سُنانا،
ملاحیاں سُنانا (یعنی گالیاں دینا وغیرہ) ہوتا ہے۔ مثلاً:
"میں بھی اُس کو ایسی سُناؤں گا کہ یاد کرے۔"
اس ذیل میں ایک لطیفہ کہیں پڑھا تھا اُس کا نقل کر دینا بھی دلچسپی سے خالی
نہ ہوگا۔ ایک صاحب نے کسی گویّے سے گانے کی فرمائش ان الفاظ میں کی:
"صاحب، آپ اس وقت ہمیں ضرور کچھ سُنائیے۔"
گویّے نے جواب دیا: "نالائق، پاجی، گدھا، اُلو ______ اور کچھ
سُنیئے گا یا بس؟"

۱۱۔ لگنا:

مثالیں:۔ ۱۔ میرا دوست آج کل گورنمنٹ کالج میں پروفیسر لگا ہوا ہے۔
۲۔ اوّل آنے والے طالب علم کو وظیفہ لگا دیا گیا۔
لگنا اگرچہ معنی کے اعتبار سے ان جملوں میں غلط نہیں معلوم ہوتا، مگر
خلافِ محاورہ ہونے کے باعث اُردو میں اس طرح استعمال نہیں ہوتا۔ پہلے
جملے میں "لگا ہوا ہے" کے بجائے صرف "ہے" کافی ہے۔ یا، اگر مزید وضاحت
ضروری ہو تو "ہوگیا ہے" یا "بن گیا ہے"، موزوں ہوگا۔
دوسرے جملے میں "لگا دیا گیا" "کی جگہ" دے دیا گیا"، یا "جاری کر دیا گیا"
مناسب ہوگا۔
البتہ "کام پر لگ جانا"، ایک درست محاورہ ہے، جس کا مطلب

"کام شروع کر دینا" یا روزگار حاصل کرلینا" ہے۔ مثلاً:
۱۔مزدور کام پر لگ گئے (یعنی انھوں نے کام شروع کر دیا۔)
۲۔میرا لڑکا اب کام پر لگ گیا (یعنی اُسے روزگار مل گیا)

۱۲۔(باقاعدہ، باضابطہ، دانستہ) طور پر

مثالیں:۔۱۔ساری کارروائی باقاعدہ طور پر رجسٹر میں درج ہے۔
۲۔ملازمت کے لیے درخواستیں باضابطہ طور پر ارسال کرنی چاہییں۔
۳۔اس نے دانستہ طور پر (یا نادانستہ طور پر) میری بات نظرانداز کر دی۔
نہ معلوم ان الفاظ کے ساتھ "طور پر" اضافہ کرنا کیوں اور کب سے رائج ہو گیا، حالانکہ اس اضافے کے بغیر بھی یہ مفہوم پورا دیتے ہیں۔ "باقاعدہ، باضابطہ، دانستہ، نادانستہ، قواعد کی رُو سے اسمائے تمیز (Adverb) ہیں۔ ان کے ساتھ "طور پر" لگا دینا نہ صرف غیر ضروری ہے، بلکہ اہلِ ذوق کو سخت گراں گزرتا ہے۔

۱۳۔شروع ہے:

مثال: ستمبر کی پہلی تاریخ سے کالج میں داخلہ شروع ہے۔
یہ جملہ غلط ہے۔ "شروع ہے" کے بجائے "جاری ہے" یا "شروع ہو گیا، (یا ہو چکا) ہے" ٹھیک ہے۔

۱۴۔کو:

مثالیں:۔۱۔میں نے اپنے لڑکے کو تھپّڑ مارا۔

۲ - بچّے کو کتّے نے کاٹ کھایا -
۳ - تم نے اُس کو سُوئی کیوں چُبھوئی - ؟
۴ - بچّے کو دوا (یا ٹیکہ) لگا دو -
۵ - ہاکی کھیلنے میں ہم سب کو چوٹیں آئیں -
۶ - مجھ کو درد ہو رہا ہے -
۷ - اقبال کو بیٹا پیدا ہوا -

مارنا، کاٹنا، چبھونا، لگنا، لگانا، یعنی ایسے تمام افعال جن کا مطلب کوئی نہ کوئی تکلیف پہنچانا یا کچھ لگانا یا لگنا ہوتا ہے، پُرانی اُردو میں "کو" کے ساتھ آتے تھے۔ مگر جدید اُردو میں ان تمام موقعوں پر "کے" آتا ہے، بشرطیکہ مفعول کوئی جاندار ہستی ہو۔ چنانچہ اُوپر کے جملے یوں درست ہیں :-

۱ - میں نے اپنے لڑکے کے تھپڑ مارا -
۲ - بچّے کے کتّے نے کاٹ کھایا -
۳ - تم نے اُس کے سوئی کیوں چُبھوئی ؟
۴ - بچّے کے دوا (یا ٹیکہ) لگا دو -
۵ - ہاکی کھیلنے میں ہم سب کے چوٹیں آئیں -
۶ - میرے درد ہو رہا ہے -
۷ - اقبال کے بیٹا پیدا ہوا -

یہاں ایک دو باتوں کی وضاحت ضروری ہے :-

(الف) "مارنا" اگر متعدی بہ یک مفعول ہے (یعنی ایک ہی مفعول چاہتا ہے) تو اس کے ساتھ "کو" آئے گا، جیسے :
"مَیں نے اپنے لڑکے کو مارا"۔

درست ہے۔ کیونکہ مارا کا صرف ایک مفعول لڑکے[1] ہے۔ لیکن اگر مارنا متعدی بہ دو مفعول ہو (یعنی دو مفعول چاہتا ہو) تو کے درست ہے، جیسے گھونسا یا تھپڑ مارنا میں ایک مفعول گھونسا یا تھپڑ ہے، اور دوسرا وہ شخص جس کو مارا جائے۔

گولی مارنا کے ساتھ اگر کو آئے تو اس کے معنی گولی سے قتل کرنا ہوں گے اور اگر کے آئے تو اس کے معنی صرف مفعول کی طرف رُخ کر کے گولی چلا دینا ہوں گے۔ مثلاً :-

۱۔ غدار کو گولی ماردی گئی (یعنی گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا)

۲۔ جو سامنے آئے گا، میں اس کے گولی مار دوں گا (یعنی، اس کی طرف رُخ کر کے گولی چلا دوں گا، خواہ وہ مر جائے یا بچ رہے)

(ب) کاٹنا کے ساتھ کے بھی آتا ہے اور کو بھی، مثلاً :

اس شخص کو سانپ نے کاٹ لیا۔

اور اس شخص کے سانپ نے کاٹ لیا۔

دونوں صحیح ہیں۔ اسی طرح مچھر، چیونٹی، بھڑ، بچھو کا کاٹنا، بلکہ انسان کا بھی کسی کو کاٹ کھانا، سب اسی حکم میں داخل ہیں۔ ان کے علاوہ باقی ہر موقعے پر کے درست ہے، کو نہیں۔

۱۵۔ کو (آنا) :- مثالیں :- (۱) حامد کو پردیس سے روپیہ آتا ہے۔

---

[1] میری تحقیق کے مطابق اس جملے میں لڑکے مفعول تو نہیں ہے، مگر قواعد کی بحث چھیڑنے کا یہ موقع نہیں، اس لیے عام قواعد نویسوں کے مطابق میں نے بھی اسے مفعول ہی بتایا ہے، ورنہ بے جا پیچیدگی پیدا ہو جاتی۔

۲۔ آپ کو کس کا خط آیا ہے۔؟

ان دونوں جملوں میں کو کے ساتھ آنا خلافِ روزمرّہ ہے۔ان کی صحیح شکلیں یہ ہوں گی :۔

۱۔حامد کے پاس پردیس سے روپیہ آتا ہے (یا "حامد کو پردیس سے روپیہ ملتا ہے")

۲۔ آپ کے نام کس کا خط آیا ہے ؟ (یا" آپ کو کس کا خط ملا ہے")

۱۶۔گئی رات :

مثالیں :۔ ۱۔ وہ گئی رات گھر پہنچا۔

۲ ۔میں گئی رات تک کام کرتا رہا۔

گئی رات بمعنی "رات کو بہت دیر تک" اُردو میں نہیں آتا۔اس کی جگہ "رات گئے" کہتے ہیں۔"گئی رات" کا مطلب "گزشتہ یا پچھلی رات" ہے،جو گزر چکی۔اگرچہ یہ بھی فصحاء کا روزمرّہ نہیں۔اس کے بجائے "گزشتہ رات" یا صرف "رات" بولتے ہیں۔مثلاً :"میں رات آیا "یعنی گزشتہ رات کو آیا۔

۱۷۔آئے روز :

"آئے روز" لکھنا یا بولنا خواہ مخواہ کا تکلّف اور غلطی ہے۔صحیح روزمرّہ "آئے دن" ہے۔

۱۸۔ کرنے کے بغیر:

مثالیں:۔ ۱۔ وہاں جانے کے بغیر کام نہ چلے گا۔
۲۔ آپ مجھ سے ملنے کے بغیر ہی چلے گئے۔!
دونوں جملوں کی صحیح صورتیں یہ ہیں:۔
۱۔ وہاں جائے بغیر کام نہ چلے گا۔
۲۔ آپ مجھ سے ملے بغیر ہی چلے گئے۔!

۱۹۔ دوائی۔ادویات:

اُردو میں اصل عربی لفظ دوا ہی فصیح مانا جاتا ہے۔ دوائی دیہات والوں کا روزمرّہ ہے۔ نیز اس کی جمع ادویات بھی بالکل غلط ہے، صحیح ادویہ ہے۔

۲۰۔ یکسانیت:

یہ لفظ بھی کچھ ہی عرصے سے رائج ہو گیا ہے، حالانکہ اس کی کوئی حقیقت نہیں۔ "یکسانی" خاصا سیدھا اور صاف لفظ ہے، جسے عربی قواعد کے مطابق زبردستی "یکسانیت" بنالیا گیا ہے۔

فصلِ سوم : خلافِ فصاحت

۱۔ ہی کا غلط مقام :

مثالیں :۔ ۱۔ تم نے ہی تو کہا تھا۔

۲۔ تھی تو موجود ازل سے ہی تری ذاتِ قدیم۔ (اقبال)

۳۔ یہ میری بات کا ہی اثر ہے۔

۴۔ تم اُس کو ہی بُرا بھلا کہتے ہو۔

۵۔ مَیں نے کھانے کے لیے ہی یہ چیزیں خریدی ہیں۔

۶۔ مولوی صاحب کے وعظ کا مجھ پر ہی اثر نہیں ہوا۔

ان تمام جملوں میں حروفِ جار (نے، سے، کا، کو، کیلئے، پر) کے بعد حرفِ تخصیص ہی لایا گیا ہے لیکن فصحا کے نزدیک حرفِ جار سے پہلے اور اسمِ مخصوصہ کے فوراً بعد لانا چاہیے۔ اُوپر کے جُملے قواعد اور روزمرّہ کے لحاظ سے غلط تو نہیں، البتہ خلافِ فصاحت ضرور ہیں۔ ان کی یہ صورتیں بہتر ہیں :۔

۱۔ تمھی (یا تم ہی) نے تو کہا تھا۔

۲۔ تھی تو موجود ازل ہی سے تری ذاتِ قدیم۔

۳۔ یہ میری ہی بات کا اثر ہے (یا : "یہ میری بات ہی کا اثر ہے۔")

۴۔ تم اُسی (اُس ہی) کو بُرا بھلا کہتے ہو۔

۵ - مَیں نے کھانے ہی کے لیے یہ چیزیں خریدی ہیں۔
۶ - مولوی صاحب کے وعظ کا مجھ پہ اثر نہیں ہوا۔

مختصر یہ کہ تمام حروفِ جار کو ہی کے بعد لانا چاہیے۔ بلکہ یہ خیال رہے کہ جس اسم کی تخصیص کرنا ہو، اُسی کے بعد ہی آتے۔ مثلاً، اُوپر کی مثال نمبر ۳ کی دو صورتیں درج کی گئی ہیں۔ پہلے جُملے (یہ میری ہی بات کا اثر ہے) کا مطلب ہوگا کہ یہ کسی اور شخص کی نہیں بلکہ میری بات کا اثر ہے۔ لیکن دوسرے جُملے (یہ میری بات ہی کا اثر ہے) کا مطلب ہوگا کہ میری صرف بات ہی اثر کر گئی۔ مارنے پیٹنے وغیرہ کی نوبت نہ آئی۔

استثنا: صرف دو موقعوں پر ہی حرفِ جار کے بعد آنا جائز ہے:-

۱ - میں نے ہی،
۲ - تُو نے ہی۔

بابائے اُردو مولوی عبدالحق مرحوم نے اپنی قواعدِ اُردو میں صرف پہلا استثنا (میں نے ہی) درست قرار دیا ہے، مگر میرے خیال میں تو نے ہی بھی درست ہے۔ کیونکہ تو ہی نے اچھا نہیں معلوم ہوتا اور اہلِ لکھنؤ کے سوا عام اہلِ زبان اِس طرح بولتے بھی نہیں۔ لہٰذا اس کا قاعدہ یہ ہُوا کہ میں نے ہی صرف جائز نہیں بلکہ ضروری ہے، البتہ تُو نے ہی صرف جائز ہے۔ یعنی، میں ہی نے غلط ہے، اور تو ہی نے صحیح مگر خلافِ اولیٰ ہے۔

بعض موقعوں پر جب زیادہ زور دینا مقصود ہو تو ہی کو اسمِ مخصوصہ سے بھی پہلے لاتے ہیں۔ مثلاً:-

"آپ دو چار دن ہی میں ٹھیک ہو جائیں گے"
جملہ درست ہے مگر اس سے فصیح تر صورتیں یہ ہوں گی:-

"آپ دو چار ہی دن میں ٹھیک ہو جائیں گے۔" یا
آپ دو ہی چار دن میں ٹھیک ہو جائیں گے۔"
یہاں یہ بتانا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ ہی کو حرفِ جار سے پہلے لانے میں اتنی شدت اور اہتمام لکھنؤ اور اُس کے زیرِ اثر علاقوں، اودھ، مشرقی یوپی اور بہار والوں کی بول چال میں پایا جاتا ہے۔ بلکہ بعض اوقات تو بولنے والے اسمِ مخصوصہ کو توڑ کر اُس کے بیچ میں ہی لاتے ہیں، مثلاً :۔
۱۔ میں بھی گوجراں والہ ہی کا رہنے والا ہوں۔
۲۔ بنّے خاں ہی سے پوچھو کہ کیا ہوا۔
اِن جملوں کو وہ اس طرح بولیں گے :۔
۱۔ میں بھی گوجراں ہی والے کا رہنے والا ہوں۔
۲۔ بنّے ہی خاں سے پوچھو کہ کیا ہوا۔
مگر دلی اور اس کے زیرِ اثر علاقوں والے بول چال میں اس کی زیادہ پروا نہیں کرتے، بلکہ جو طریقہ آسان معلوم ہوتا ہو اُسی پر عمل کرتے ہیں۔ لسانی مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اُردو کی قدیم ترین رشتہ دار دیہاتی بولیوں، (کھڑی بولی، ہریانی، برج بھاشا) میں ہی حرفِ جار کے بعد بولا جاتا ہے۔ چنانچہ آجکل کی رائج شدہ ہندی میں بھی، جو دیہاتی بولی سے بہت قریب ہے، اسی طرح ہی کو حرفِ جار کے بعد لاتے ہیں، لیکن اُردو کے اہلِ زبان شعرا کے ہاں، خواہ وہ دہلوی ہی کیوں نہ ہوں۔ سوداؔ اور میرؔ کے سے قدیم زمانے میں بھی ہی کو حرفِ جار سے پہلے استعمال کرنے کا رُجحان قوی تر ملتا ہے۔ پھر جب اُردو نثر لکھنے کا رواج ہوا تب بھی یہی طریقہ جاری رہا اور آج تک ہے، یہاں تک کہ بابائے اُردو نے بھی اپنی قواعد میں اسی کو

صحیح قرار دیا۔

۲۔ کر بیٹھا ہوں، وغیرہ :

مثال : "میں تو بہت دیر ہوئی، کھانا کھا بیٹھا ہوں۔"

اُردو میں "کر بیٹھنا" ایسے موقعے پر آتا ہے جب کوئی کام غلطی سے یا
بے سوچے سمجھے کر لیا جائے اور بعد میں پشیمان ہونا پڑے۔ مثلاً :
"میں گھوڑا چل بیٹھا، اور مجھے مات ہو گئی۔" (شطرنج)

پس اُوپر کے جملے میں "کھا بیٹھا ہوں" کے بجائے "کھا چکا ہوں" درست ہے۔
واضح رہے کہ "کر بیٹھنا" کے جو معنی اُوپر بیان ہوئے یہ صرف محاورے کی
رُو سے ہیں لہٰذا، اگر "بیٹھنا" سے مرکب کوئی فعل اپنے اصل معنوں میں آئے گا
تو اس کے معنی خواہ مخواہ پشیمانی کا کام کر ڈالنے کے نہ ہوں گے۔ مثلاً :
"میں نیچے سے اُٹھ کر کُرسی پر جا بیٹھا۔"
اس کے یہ معنی نہیں کہ میں غلطی سے کُرسی پر بیٹھ گیا، اور بعد میں پچھتایا بلکہ
اس کے سیدھے سادھے معنی وہی ہوں گے جو الفاظ سے ظاہر ہیں۔

۳۔ اور یا :

مثال : "یا تو میں تمھاری بات نہ سمجھ سکا، اور یا تم خود پاگل ہو۔"
اُردو میں "یا" سے پہلے "اور" لگانا فارسی روزمرہ کا لفظی ترجمہ ہے۔ فارسی
میں ایسے موقعے پر "و یا" لاتے ہیں، قاآنی کہتا ہے :

و یا در تیرہ چہ بیژن نہفتہ چہرہ روشن
و یا روشن گہر بہمن شدہ در کام اژدرہا

اُردو میں بھی ویا شاعری میں استعمال ہوتا رہا ہے۔ اقبال کہتے ہیں ؎

میں یہ کہتا تھا، کہ آواز کہیں سے آئی
بامِ گردوں سے، ویا صحنِ زمیں سے آئی

اُردو بول چال میں بھی اوریا آج تک استعمال ہوتا ہے مگر اب تحریراتِ نظم و نثر میں اوریا لانا اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ اس کی جگہ صرف یا کافی ہے اور اگر زور دینا مقصود ہو تو یا پھر لانا چاہیے، مثلاً اوپر کی مثال یُوں بہتر ہوگی :-

" یا تو میں تمھاری بات نہ سمجھ سکا، یا پھر تم خود پاگل ہو۔

۴ - باوجود بھی :

مثال :- میرے والد نے کمزوری اور بیماری کے باوجود بھی رمضان کے سب روزے رکھے۔

قواعد اور معنی کی رُو سے "باوجود بھی" غلط تو نہیں معلوم ہوتا اور اہلِ زبان حضرات بھی، کبھی کبھی اس طرح بول اور لکھ لیتے ہیں۔ لیکن میری دانست میں یہ خلافِ فصاحت ہے، کیونکہ اعلیٰ پائے کے اہلِ قلم اس طرح نہیں لکھتے اور بولنے میں بھی یہ کانوں کو ناگوار لگتا ہے۔ ایسے موقع پر صرف باوجود کافی ہے۔

۵ - ہو گزرا ہے :

مثال : اقبالؒ اُردو کا بڑا شاعر ہو گزرا ہے۔

"ہو گزرا ہے" غیر فصیح ہے۔ پچھلی صدی تک تو یہ تحریر میں رائج تھا مگر اب اس طرح نہیں لکھا یا بولا جاتا۔ اس کی جگہ صرف گزرا ہے یا ہوا ہے کافی ہے۔

۶ - جو کہ۔ جبکہ۔ یعنی کہ :

مثالیں :- ا - میرا لڑکا، جو کہ دو سال ہوئے انگلینڈ گیا تھا، آج وطن واپس پہنچا۔

۲ - وہ وقت یاد کرو جبکہ تم پہلی بار میرے پاس آئے تھے۔

جو، جب، جہاں، جس، جن، یعنی کے ساتھ کہ لانا غلط تو نہیں، بلکہ پچھلی صدی کے نامور ادیبوں، سرسیّد، مولوی نذیر احمد، آزاد جیسے اکابر نے بھی اس طرح لکھا ہے، لیکن آجکل اسے اچّھا نہیں سمجھا جاتا اور یہ لفظ اب کہ کے بغیر لائے جاتے ہیں، اس لیے ان الفاظ کے ساتھ کہ لانا خلافِ فصاحت ضرور ہو گیا ہے۔

البتہ ایک موقع پر جب کہ درست بلکہ ضروری ہے : یعنی، جب دو چیزوں یا باتوں یا حالتوں کا تقابل یا موازنہ مقصود ہو۔ مثلاً :-

ا - تم ایسے شریر ہو، جبکہ تمھارا بھائی اتنا نیک ہے۔

۲ - وہ مجھے بُرا بھلا کہے جا رہا تھا، جبکہ میں خاموش بیٹھا سُن رہا تھا۔

۳ - نصیحت کا کیا فائدہ ہو سکتا ہے جبکہ ناصح خود اس پر عمل نہ کرتا ہو۔

ایسی صورتوں میں جبکہ کا مفہوم دراں حالیکہ ہوتا ہے۔ لہٰذا یہاں صرف جب لانا غلط ہے، کیونکہ اس کا وہ مفہوم نہیں۔

۷ - بہبودی، انکساری :

فارسی کی رُو سے "بہبودی" اور عربی کی رُو سے "انکساری" اگرچہ بالکل غلط ہیں اور اس طرح ان دونوں کا بیان پہلی فصل میں آنا چاہیے، مگر چونکہ اُردو میں یہ دونوں الفاظ رائج ہو چکے ہیں اس لیے اُردو کی رُو سے یہ درست ہیں تاہم فصحا ان کا

استعمال پسند نہیں کرتے۔ ان کی جگہ ان کی صحیح شکلیں "بہبود" اور "انکسار" لانا چاہیئے۔ البتہ "عاجزی" درست ہے، کیونکہ اس کی اصل عربی شکل "عجز" اُردو میں ثقیل ہے۔ اس لیے اسے اسمِ فاعل "عاجز" میں "ی" بڑھا کر "عاجزی" بنا لیا گیا ہے۔ اسی طرح "تعیناتی" بھی درست ہے۔ حالانکہ اس کی اصل شکل "تعین" ہونا چاہیئے۔ مگر "تعین" کے معنی اُردو میں کسی شخص کو کسی عہدے یا کام پر مامور کر دینے کے نہیں آتے۔ اس کے لیئے "تعیناتی" ہی صحیح ہے۔

دوسرا باب

اِنصراف

اِنصراف کا مسئلہ بہت غور سے سمجھنے اور یاد رکھنے کا ہے، کیونکہ اِس کی بہت سی صورتیں ہیں اور اس میں لوگ بہت غلطیاں کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ اس کے تمام جامع و مانع ضابطے بھی ابھی تک کسی قواعد یا لغت کی کتاب میں نظر سے نہیں گزرے۔ اِس کی اسی اہمیت کے پیشِ نظر، اس کے لیے علیحدہ باب باندھا گیا ہے۔

اِنصراف چند ضابطوں کے اُسی مجموعے کا نام ہے جسے لغت یا قواعد کی بعض کتابوں میں "اِمالہ" بھی لکھا گیا ہے، اور بعض حضرات اسے "تغیر" بھی کہتے ہیں مگر ہمارے نزدیک اس کا سب سے موزوں نام انصراف ہی ہے۔

تعریف | انصراف اُس کُلّی یا جُزوی تبدیلی کا نام ہے جو کسی لفظ کے حالت مجروری میں آنے سے پیدا ہوتی ہے (حالتِ مجروری اُس حالت کا نام ہے جب کسی لفظ پر حرفِ جار — سے، تک، میں، کا، پر، نے، کو وغیرہ — لایا جائے)

جو الفاظ (وہ اسم ہوں یا حرف) اس طرح حرفِ جار آنے سے شکل بدل لیتے ہیں وہ "مُنصرِف" کہلاتے ہیں۔

جن الفاظ کی شکل حالتِ مجروری میں نہیں بدلتی وہ "غیر منصرف" کہلاتے ہیں۔

فعل پر انصراف کا عمل بالکل نہیں ہوتا، کیونکہ فعل پر حرفِ جار لایا ہی

نہیں جاتا۔

چند مثالوں سے انصراف کا عمل واضح ہو سکے گا۔

کُلّی تبدیلی کی مثال :۔

۱۔ وہ شخص یہاں آیا تھا۔

۲۔ اُس شخص کو بُلا لاؤ۔

پہلے جملے کا "وہ" دوسرے جملے میں "اُس" بن گیا، کیونکہ اس کے اوپر حرفِ جار "کو" لایا گیا ہے۔

جُزئی تبدیلی کی مثال :۔

۱۔ لڑکا کرسی پر بیٹھا ہے۔

۲۔ لڑکے سے غلطی ہو گئی ہو گی۔

پہلے جملے کا "لڑکا" دوسرے جملے میں حرفِ جار "سے" آنے سے "لڑکے" بن گیا، یعنی صرف آخری الف بدل کر ے ہو گیا۔

انصراف کا عمل سمجھ میں آجانے کے بعد اب اس کے تفصیلی ضابطوں کا مطالعہ کرنا چاہیئے کہ کون کون سے اور کس کس قسم کے الفاظ منصرف ہیں اور کون سے غیر منصرف۔

(۱) اَسْماء

۱۔ تمام اسمائے ذات (NOUNS) کی جمعیں مُنصرف ہیں، بشرطیکہ عربی یا کسی اور غیر زبان کے طریقے پر نہ بنائی گئی ہوں۔ مثلاً: "رسالہ" کی جمع اُردو قاعدے کی رُو سے "رسالے" ہے، جو مجرور ہو کر "رسالوں" بن جاتی ہے۔ مگر اس کی عربی جمع "رسائل" ہے۔ اور یہ اسی طرح رہتی ہے یعنی غیر منصرف ہے۔ اسی طرح "چیزیں" منصرف ہے، کیونکہ مجرور ہو کر "چیزوں"

چنانچہ میں منصرف ہو کر مجھ بن جاتا ہے } یہ دونوں لفظ "نے" لانے سے شکل نہیں
تو منصرف ہو کر تجھ بن جاتا ہے } بدلتے (یعنی میں نے، تو نے)

وہ 〃 〃 〃 اُس (یا جمع کی صورت میں اُن[۱]) بن جاتا ہے۔
یہ 〃 〃 〃 اِس (یا 〃 〃 〃 〃 اِن[۲]) 〃 〃 〃
جو 〃 〃 جس (〃 〃 〃 〃 جن[۳]) 〃 〃 〃
کون اور کیا[۴] منصرف ہو کر کس (〃 〃 〃 کن[۵]) 〃 〃 〃
کوئی 〃 〃 〃 کسی بن جاتا ہے۔

بن جاتی ہے، مگر "چیزہا" غیر منصرف ہے، جو فارسی طریقے سے بنائی گئی ہے۔ یہی حال انگریزی الفاظ کا ہے، مثلاً "ٹرینیں" سے "ٹرینوں" تو بن جاتا ہے، لیکن انگریزی طریقے کی جمع "ٹرینز" (Trains) اگر اُردو میں استعمال بھی ہو تو غیر منصرف رہے گی۔

۲ - واحد اسمائے ذات میں سے جتنے مؤنث ہیں وہ سب غیر منصرف ہیں۔ چنانچہ لڑکی، عورت، گڑیا وغیرہ پر حرفِ جار لانے سے ان کی شکل نہیں بدلتی، مثلاً لڑکی سے، عورت کو، وغیرہ۔

۳ - جو واحد مذکر اسماء الف یا ہ پر ختم نہیں ہوتے وہ بھی سب غیر منصرف ہیں۔ (مثلاً) آدمی، بیل، مکان، وغیرہ۔

۴ - اسمائے ضمیر میں سے ہم، تم، آپ، غیر منصرف ہیں، اور میں، تو، وہ، یہ، جو، کون، کوئی، کیا، منصرف ہیں۔

چنانچہ میں منصرف ہو کر مجھ بن جاتا ہے (یعنی: میں نے، تو نے) تو منصرف ہو کر تجھ بن جاتا ہے، وہ منصرف ہو کر اُس (یا، جمع کی صورت میں اُن[۱]) بن جاتا ہے۔

یہ منصرف ہو کر اس (یا جمع کی صورت میں ان[2]) بن جاتا ہے۔
جو 〃 〃 جس (〃 〃 〃 〃 جن[2]) 〃 〃 〃
کون اور کیا[3] منصرف ہو کر کس (〃 〃 〃 〃 〃 کن[2]) 〃 〃 〃
کوئی 〃 〃 کسی بن جاتا ہے۔

۴ (الف) تمام اردو مصادر بھی منصرف ہیں۔ مثلاً: آنا، جانا، کرنا، لانا وغیرہ منصرف ہو کر آنے، جانے، کرنے، لانے وغیرہ بن جاتے ہیں۔
اسی طرح حالیہ تمام (مثلاً: کیا ہوا، آیا ہوا) اور حالیہ ناتمام (مثلاً: کرتا ہوا، آتا ہوا) بھی منصرف ہیں۔

۵۔ تمام واحد مذکر ہندی[4] اسمائے ذات و اسمائے صفات، جو الف یا ہ پر ختم ہوتے ہیں، منصرف ہیں۔ چنانچہ لڑکا، گھوڑا، لوٹا، دھنیہ، وغیرہ، (جو اسمائے ذات ہیں) منصرف ہو کر لڑکے، گھوڑے، لوٹے، دھنیے وغیرہ بن جاتے ہیں۔ اسی طرح اپنا، پرایا، اچھا، برا، پہلا، دوسرا وغیرہ۔ (جو اسمائے صفات ہیں) منصرف ہو کر اپنے، پرائے، اچھے، برے، پہلے، دوسرے وغیرہ بن جاتے ہیں۔
جن اسماء کے آخر میں الف کے بعد ن غنہ ہو وہ بھی منصرف ہیں مثلاً کنواں؛

---

[1]، [2]، [3]،

[3] کیا حرف استفہام بھی ہے اور اس صورت میں وہ مجروری نہیں ہوتا کہ منصرف ہو۔
[2] نے لگنے سے یہ چاروں علی الترتیب انھوں، اِنھوں، جنھوں، کنھوں بن جاتے ہیں
[4] ہندی سے یہاں مراد دیسی، مقامی بولیاں ہیں، نہ کہ وہ مصنوعی زبان جو اس وقت بھارت کی سرکاری زبان قرار دی گئی ہے۔

سے کوزہیں ہوجاتا ہے۔

جن اسمائے کے آخر میں ہ سے پہلے الف یا واو یا ی ہو وہ غیر منصرف ہیں۔ مثلاً بیاہ، نباہ، مکوہ، دیہ (معنی جسم) وغیرہ۔

واضح رہے کہ جن اسمائے ذات کا یہاں ذکر ہوا وہ نکرہ ہیں، معرفہ اسمائے ذات کے ضابطے آگے آتے ہیں۔

۶ - غیر زبانوں کے مذکر[۷] کے لیے جو الف یا ہ پر ختم ہوتے ہیں حسب ذیل قاعدے ہیں :-

(الف) تمام عربی و فارسی اسمائے صفات غیر منصرف ہیں، چنانچہ نابینا سے نابینے اور صغیرہ وکبیرہ (گناہ) سے صغیرے وکبیرے بنانا غلط ہے۔

(ب) تمام سنسکرت کے اسماء غیر منصرف ہیں۔ چنانچہ راجا، بابا[۸]، دیوتا وغیرہ سے راجے، بابے، دیوتے بنانا غلط ہے (ایسے سنسکرت کے اسماء اُردو میں چند ہی ہیں)

(ج) تمام عربی اسماء جو الف ممدودہ پر ختم ہوتے ہیں، غیر منصرف ہیں۔ (الف ممدودہ کی پہچان یہ ہے کہ اس کے بعد چھوٹی سی ہمزہ بھی آتی ہے) چنانچہ عصاء، صفراء، سوداء، صحراء سے عصے، صفرے، سودے، صحرے بنانا غلط ہے۔ (واضح رہے کہ یہ سوداء اور ہے، اور وہ سودا جس کے معنی خریدی ہوئی چیز کے ہیں، اور ہے۔ دوسرا سودا، جو فارسی لفظ ہے، منصرف ہے)

---

[۷] یعنی جو اُردو میں مذکر بولے جاتے ہوں، خواہ اصل زبان میں مونث ہی ہوں۔

[۸] بابا سنسکرت اور فارسی دونوں کا لفظ ہے۔

(ﮦ) تمام فارسی و عربی اسمائے ذات، جو الف یا ہ پر ختم ہوتے ہیں، منصرف ہیں بشرطیکہ آخری ہ سے پہلے الف یا واو یا ی نہ ہو، یا یہ الفاظ یا پر نہ ختم ہوتے ہوں۔ چنانچہ سلسلہ، قبیلہ، روزہ، دعویٰ، تقویٰ وغیرہ سلسلے، قبیلے، روزے، دعوے، تقوے وغیرہ بن جاتے ہیں۔ مگر ماہ، کوہ، تنبیہ، دریا وغیرہ غیر متبدل رہتے ہیں۔

یہاں یہ واضح کرنا بھی ضروری ہے کہ لوگ عام طور پر عربی، فارسی الفاظ کی منصرف شکلوں کا اِملا نہیں بدلتے۔ یعنی مثلاً "اس سلسلے میں" لکھنے کے بجائے "اس سلسلہ میں" لکھتے ہیں۔ اگرچہ ہماری رائے میں منصرف شکلوں کا اِملا بھی بدلنا چاہیے، لیکن کم از کم پڑھنے والوں کو اِملا بدل کر ہی پڑھنا چاہیے یعنی "اس سلسلہ میں" کو "اِس سلسلہ میں" پڑھنا غلط ہے۔

(ﻭ) تمام عربی الفاظ، جو ع یا ح پر ختم ہوتے ہیں، منصرف ہیں، بشرطیکہ آخری ع یا ح سے پہلے کوئی حرفِ علّت (الف، واو، ی) نہ ہو، بلکہ زَبَر ہو۔ مثلاً موقع، مصرع، مطلع، مذبح وغیرہ کو مجرور حالت میں موقعے، مصرعے، مطلعے، مذبحے وغیرہ پڑھنا چاہیے۔

اِس کی وجہ یہ ہے کہ اُردو میں ع اور ح کا تلفظ نہیں ہوتا اور اُن کی جگہ ہ بولی جاتی ہے، یعنی عام بول چال میں موقع، مذبح کو موقہ، مذبہ بولا جاتا ہے۔ لہٰذا ان پر بھی وہی قاعدہ لاگو ہوتا ہے، جو اُوپر شق (د) میں بیان ہوا۔ اِسی طرح نفع کا اُردو تلفظ نفا ہے، لہٰذا اس کی منصرف شکل نفے بولنا درست ہے۔

(ز) انگریزی اسماء کے بارے میں اختیار ہے، خواہ منصرف لایا جائے یا غیر منصرف۔

۷۔ اسمائے معرفہ، خصوصاً عَلَم (Proper Nouns) بالعموم غیر منصرف ہوتے ہیں۔ مگر ان میں سے بعض منصرف بھی ہیں۔ ان کے لیے یہ قاعدے ہیں :۔

(الف) قوموں یا ذاتوں کے نام یا عرفت غیر منصرف ہیں، مثلاً شرما، مِسرا، بھاٹیہ وغیرہ۔ چنانچہ مرزا، یا لالہ کو مرزے یا لالے لکھنا یا بولنا غلط ہے۔

(ب) انسانوں کے نام بالعموم غیر منصرف ہیں، مگر دیسی ساخت کے بعض نام مثلاً گھسیٹا، اللہ دیا، اللہ رکھا، بنّا، چھوٹا، ننھا، نوشہ منصرف ہیں، اور بعض مثلاً کلوا، بُڈھا، جمعہ (جُمّا)، مسیتا، دولہا غیر منصرف۔ اس بارے میں کوئی قاعدہ کلیہ نہیں بنایا جاسکتا۔ عام اصول یہ معلوم ہوتا ہے کہ جو انسانی نام روزمرّہ کی بول چال میں اتنا بے تکلفی سے استعمال ہوتا ہو کہ وہ نام نہیں بلکہ عام گفتگو کا لفظ معلوم ہوتا ہو وہ منصرف ہو جاتا ہے، اور جو نام اتنا بے تکلف جزو زبان نہ بن سکا ہو وہ غیر منصرف رہتا ہے اور ظاہر ہے کہ یہ محض اہل زبان کے ذوق پر منحصر ہے۔

(ج) پاک و ہند کے تمام شہروں اور گاؤں کے نام منصرف ہیں، سوائے اُن کے جنھیں کوئی مذہبی یا تاریخی اہمیت حاصل ہو، یا جو یا پر ختم ہوتے ہوں۔ چنانچہ کلکتہ، پونا، سرگودھا، گوجرانوالہ منصرف ہیں، مگر متھرا، ٹیکسلا، بلیا غیر منصرف، کیونکہ متھرا مذہبی اہمیت کا شہر ہے، ٹیکسلا تاریخی اہمیت کا اور بلیا کے آخر میں یا آتا ہے (آخری شہر کے غیر منصرف ہونے کی وجہ میری سمجھ میں یہ آتی ہے کہ یا پر ختم ہونے والے الفاظ عموماً مؤنث ہوتے ہیں، اور مؤنث اسماء غیر منصرف ہوتے ہیں۔ لہٰذا مؤنث اسمائے سے مشابہت رکھنے والے یہ نام بھی غیر منصرف ہیں۔)

دوسرے تمام ملکوں کے شہروں کے نام غیر منصرف ہیں، سوائے ان پانچ

کے :۔ مکہ، مدینہ، جدّہ، کوفہ، بصرہ، اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ مسلمانوں کو ان شہروں سے اتنا غیر معمولی لگاؤ ہے کہ گویا یہ غیر ملکی نہیں، اپنے ہی وطن کے شہر ہیں۔

(د) ملکوں، پہاڑوں، صوبوں اور دریاؤں کے نام بھی غیر منصرف ہیں۔ (خود لفظ دریا بھی غیر منصرف ہے۔) البتہ شملہ منصرف ہے، کیونکہ یہ پہاڑ کا نہیں، شہر کا نام ہے۔

(ہ) تمام بزرگانہ القاب اور عہدے غیر منصرف ہیں، مثلاً آغا، آقا، مولا، مکھیا، فرماں روا، راجہ وغیرہ۔

(و) تمام بزرگ رشتے غیر منصرف ہیں، یعنی: ابّا، چچا، دادا، نانا، بابا، باوا، بھیا، دولھا، ماما (اگرچہ اردو میں ماما کے بجائے ماموں فصیح ہے) اور تمام خورد رشتے منصرف، یعنی بیٹا، پوتا، نواسا، بھانجا، بھتیجا۔

سالا، خواہ بڑا ہو یا چھوٹا، منصرف ہے۔

۸۔ فارسی و عربی الفاظ، جو کسی فارسی اضافت یا عطف کے ساتھ آئیں، غیر منصرف ہو جاتے ہیں، مثلاً زمانہ منصرف ہے، مگر اقتضائے زمانہ میں یہ غیر منصرف ہو جائے گا۔ اسی طرح دانہ منصرف ہے، مگر دام و دانہ کی ترکیب میں غیر منصرف ہے۔

۹۔ حروفِ جار کا یہ عمل اسمائے صفات کی جمع پر نہیں ہوتا۔ مثلاً اچھا لڑکا کی جمع اچھے لڑکے ہے۔ حرفِ جار لانے سے لڑکے تو لڑکوں میں بدل جائے گا، مگر اچھے سے اچھوں نہیں بنے گا۔ جیسے "اچھے لڑکوں کا طریقہ" وغیرہ۔ البتہ اگر کبھی اسمِ صفت بطور اسمِ ذات کے استعمال ہو تو اُس کی جمع منصرف ہوگی۔ مثلاً :۔

ع ہم تو بُروں کی جان کو پہلے ہی رو گئے (سودا)
ع ہوئی آئی ہے کہ اچھوں کو بُرا کہتے ہیں (غالب)

اِن مصرعوں میں بُروں اور اچھوں اسمِ ذات کے طور پر آتے ہیں؛ اور ان کا مطلب "بُرے لوگوں" اور "اچھے لوگوں" ہے۔ اسی طرح زندہ، مُردہ اسمِ ذات بن کر زندوں، مُردوں ہو جاتے ہیں۔

---

۲ - حرُوف

(الف) حروف میں سے حرفِ اضافت کا منصرف ہے اور اسی طرح والا بھی جب کا کے معنوں میں استعمال ہو تو منصرف ہو جاتا ہے، مثلاً شیروں والا باغ، اسلم والا مکان، وغیرہ میں والا منصرف ہو کر والے بن جاتا ہے۔ کیونکہ یہاں یہ کا کے معنوں میں آیا ہے۔

واضح رہے کہ حرفِ اضافت پر کوئی حرفِ جار نہیں آتا، بلکہ اُس اسم پر آتا ہے جو حرفِ اضافت کے فوراً بعد آئے (یعنی مضاف پر) مثلاً: "حامد میاں کا گھر" "اسم والا مکان" اس فقرے پر حرفِ جار آئے تو کا سے کے اور والا سے والے ہو جائے گا، یعنی: "حامد میاں کے گھر میں"، "اسلم والے مکان کو" وغیرہ۔

البتہ چونکہ حروفِ اضافت حروفِ جار کا کام بھی کرتے ہیں۔ اس لیے یہ مُضاف الیہ کو (اگر وہ مُنصرف ہو) بدل دیتے ہیں۔ کیونکہ مضاف الیہ ان کا مجرور ہوتا ہے، مثلاً: اُس کا بھائی، لڑکے کا باپ، وغیرہ، وغیرہ۔

یہ بھی واضح رہے کہ والا، والے، والی، والیاں، یہ چاروں الفاظ حروفِ جار

تو خاص خاص موقعوں پر ہوتے ہیں، لیکن اس صورت کے ماسوا نہ اسم ہیں، نہ فعل، نہ حرف بلکہ محض جزوِ کلمہ، یعنی لاحقہ۔ جیسے فارسی میں گر اور دار لاحقے ہیں۔ اِن لاحقوں کا کام یہ ہے کہ مصدر پر لگ کر اسم فاعل بناتے ہیں، اور دوسرے اسماء پر لگ کر صفتِ مُشبّہ۔ مثلاً: آنے والا، گھوڑوں والے، مرنے والی، گھروالیاں، وغیرہ (جیسے فارسی میں آہن گر، قلعہ دار، وغیرہ۔)
اور منصرف اسماء پر اِن لاحقوں کا عمل بھی حروفِ جار کی طرح ہوتا ہے۔

(ب) دوسرے حروف میں حروفِ مقداری اتنا کتنا، جتنا اور حروفِ کیفیت ایسا، جیسا، کیسا، سا منصرف ہیں۔ یعنی حرفِ جار آنے پر اُن کے واحد کا الف بدل کر ے بن جاتا ہے۔ مثلاً: اتنا پانی منصرف ہو کر "اتنے پانی میں" بن جائے گا۔

اِن حُروف کی جمعیں، یعنی اتنے، ایسے وغیرہ اگرچہ غیر منصرف ہیں، مگر جب یہ کسی اسم کے قائم مقام بن کر آتے ہیں تو یہ بھی منصرف ہو جاتے ہیں اور ان کی آخری ے مجرور ہو کر وں سے بدل جاتی ہے۔ مثلاً:
"کتنے آدمیوں نے یہ تماشا دیکھا؟"
اس جُملے میں کتنے نہیں بدلا، کیونکہ یہاں یہ محض حرف ہے لیکن ذیل کے جُملے میں یہ آدمیوں کا قائم مقام بن کر کتنوں ہو گیا:۔
"کتنوں نے یہ تماشا دیکھا؟"
واضح رہے کہ انگریزی قواعد کی رُو سے یہ کلمات اسماء ہیں مگر ہمارے قواعد نویس انھیں حروف شمار کرتے ہیں)۔

باقی حروف سب غیر منصرف ہیں۔

۴۔ مقدّر یا محذوف حروفِ جار

بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ منصرف الفاظ کی شکلیں بدل جاتی ہیں، مگر بظاہر کوئی حرفِ جار موجود نہیں ہوتا۔ یہ وہ صورتیں ہوتی ہیں، جب حرفِ جار گرا دیا جاتا ہے (یعنی محذوف ہوتا ہے) یا چھپا ہوا (یعنی مقدّر) ہوتا ہے، مثلاً :

۱۔ اس طرح توڑ مرے دل کو کہ آواز نہ ہو۔
۲۔ اس قدر رویا کہ ہچکی بندھ گئی صیاد کی۔
۳۔ تم یہ کام اب کرنے بیٹھے ہو؟
۴۔ یہ نیک کام آپ کے ہاتھوں سر انجام ہُوا۔

پہلی مثال میں "اس طرح" کے آگے "سے" مُقدّر ہے، یعنی "اس طرح سے"۔ دوسری مثال میں "اس قدر" بھی دراصل "اس قدر کا" ہے (پُرانے زمانے میں اس طرح بولا بھی جاتا تھا) تیسری مثال میں "کرنے بیٹھے ہو" کی اصل صورت "کرنے کو بیٹھے ہو" ہے اور چوتھی مثال میں "ہاتھوں" کے بعد "سے" محذوف ہے[1]۔ گویا ایسی تمام صورتوں میں، جہاں انصراف کا عمل نظر آ رہا ہو، مگر حرفِ جار ظاہر نہ ہو، حقیقتاً حرفِ جار موجود ہوتا ہے۔

---

[1] یا یہ بھی ممکن ہے کہ "ہاتھوں" کا آخری "وں" دراصل "سے" کی جگہ آیا ہو یعنی "آپکے ہاتھ سے" کی جگہ "آپکے ہاتھوں" بولا گیا۔ اس طرح کی اور بھی مثالیں بول چال میں آتی ہیں۔ مثلاً: "میں تمھاری حرکتیں ٹھنڈے پیٹوں برداشت نہیں کر سکتا۔" ظاہر ہے کہ یہاں "پیٹوں" جمع نہیں ہے، بلکہ "پیٹ سے" کی جگہ بولا گیا ہے۔

۴ - حروفِ ندا

اَ، اے، ارے، ابے اردو کے حروفِ ندا بھی بظاہر حروفِ جار کا سا عمل کرتے ہیں، مثلاً: او لڑکے، اے بیٹے، ارے پگلے، ابے گدھے؛ مگر اس عمل کو انصراف نہیں کہا جائے گا، کیونکہ حروفِ ندا اور حروفِ جار کے عمل میں دو واضح فرق ہیں :-

۱- پہلا فرق یہ کہ حروفِ ندا کا براہِ راست عمل صرف اسماء ذات پر ہوتا ہے کیونکہ جس کو ندا دی جاتی ہے (یعنی منادیٰ) وہ لازماً اسمِ ذات ہی ہو سکتا ہے۔ لیکن حرفِ جار کا براہِ راست عمل مصادر، ضمائر اور حروف پر بھی ہوتا ہے، جیسا کہ اوپر پوری بحث سے معلوم ہو گیا ہوگا۔

۲- دوسرا فرق جمع پر ان دونوں حروف کے آنے سے معلوم ہوتا ہے۔ حرفِ جار جمع کے صیغے کو وں پر ختم کرتا ہے اور حرفِ ندا صرف واو پر، مثلاً: لڑکوں نے میں لڑکوں کا آخری حرف نون غنہ ہے، مگر اے لڑکو میں نون غنہ نہیں آیا۔

ان دو فرقوں کے علاوہ حرفِ ندا بھی منصرف الفاظ پر حرفِ جار جیسا عمل کرتا ہے۔ لہٰذا، اصول یہ معلوم ہوا کہ منصرف اسماء حرفِ ندا سے بھی شکل بدل لیتے ہیں لیکن ہر منصرف کلمہ منادیٰ نہیں ہوتا۔

تیسرا باب

تذکیر و تانیث

اُردو زبان میں مذکّر اور مؤنث اسماء کے متعلق غیر اہلِ زبان کو شاید سب سے بڑھ کر دُشواری پیش آتی ہے، کیونکہ واقعی مذکّر اور مؤنث اسماء (انسانوں یا جانوروں) کے سوا تمام دوسرے اسماء کی تذکیر و تانیث کے کوئی منضبط اصول و قواعد اُردو میں نہیں ہیں، اور زیادہ تر اِس معاملے میں اہلِ زبان کا ذوق ہی کام کرتا ہے کہ کس چیز کو مذکّر کہا جائے اور کسے مؤنث۔

اہلِ پنجاب بھی تذکیر و تانیث کی غلطیاں کر جاتے ہیں مگر بہت کم، کیونکہ پنجابی اور اُردو میں مذکّر اور مؤنث اسماء کی فہرست تقریباً ایک سی ہے۔ تاہم غلطی، غلطی ہی ہے اور اسی وجہ سے ہم یہاں چند اصول اور چند اُن مُتداول اسمائ کی فہرست درج کر رہے ہیں، جن کے استعمال میں اہلِ پنجاب غلطی کرتے ہیں۔

سب سے پہلے عربی مصادر۔ جو اُردو میں مُستعمل ہیں، اُن کے بارے میں عام اُصول پیش کیے جاتے ہیں۔

۱۔ عام طور پر عربی ابواب مزید کے مصدر اُردو میں مذکّر ہیں۔ چنانچہ :۔

(الف) اِفعال کے وزن پر آنے والے مصادر : اِنعام، اِکرام، اِحسان، اقرار، انکار، اِقبال، اِیماء، اِجراء وغیرہ۔

تفعّل کے وزن پر آنے والے مصادر :۔ تقرّب، تشدّد، تنفّر،

تخیّل، تمتّع، وغیرہ۔

تفاعُل کے وزن پر آنے والے مصادر :- تناسُب، تجاہُل
تغافُل، تفاخُر، تداخُل وغیرہ۔

اِنفِعَال کے وزن پر آنے والے مصادر :- اِنقلاب، اِنشراح
اِنصِراف، اِنجماد، اِنخلاء وغیرہ۔

اِفتِعَال کے وزن پر آنے والے مصادر :- اِنتظار، اِنتشار،
اِقتِباس، اِفتِراق، اِنتقال وغیرہ۔

اِستِفعَال کے وزن پر آنے والے مصادر :- اِستفہام، اِستفسار،
اِستعداد، اِستقلال، اِستصواب وغیرہ

یہ تمام مصادر مذکر ہیں۔

(ب) تَفَعُّل کے وزن پر آنے والے مصادر اگر ی پر ختم ہوتے ہوں تو مؤنث ہوں گے، مثلاً ترقّی، تجلّی وغیرہ اور اسی طرح تفاعُل کے وزن پر آنے والے مصادر، مثلاً تداوی، تحاشی وغیرہ بھی مؤنث ہیں (صرف ایک مصدر تقاوی مذکر ہے، مگر یہ بھی اس لیے مذکر ہے کہ اس کے ساتھ قرضہ کا لفظ بھی آتا ہے یا محذوف ہوتا ہے) بہرحال ایسے مصادر اُردو میں گنتی کے چند ہیں اور وہ بھی بہت کم مستعمل ہیں۔

(ج) اِفتِعَال کے جو مصادر ہمزہ پر ختم ہوتے ہیں، ان میں سے کچھ مذکر ہیں، مثلاً :- ارتقاء، اِفتراء، اقتضاء، اِلتقاء وغیرہ اور بعض مؤنث ہیں، مثلاً : ابتداء، انتہا، اِقتداء، اعتناء، اشتہا وغیرہ : اور چند ایسے بھی ہیں جو دونوں طرح استعمال ہوتے ہیں، مثلاً : اِکتفاء، اِبتلاء۔

اسی طرح اِستِفعَال والے مصادر خواہ ہمزہ ہی پر ختم ہوتے ہوں، مذکر

ہیں، مثلاً: اِستقصاء، اِستفتاء، اِستیلاء، اِستقراء، اِستنجاء وغیرہ، مگر ایک مصدر اِستدعاء مؤنث ہے۔

۲۔ آخری ۃ پر ختم ہونے والے مصادر، یعنی جو مُفاعلہ اور تفعلہ کے وزن پر آتے ہیں، اُن کی دو صورتیں ہیں۔

(الف) اگر وہ اُردو میں بھی ۃ لکھے جاتے ہیں تو مذکر ہوں گے، مثلاً: مُحاصرہ، مُشاعرہ، مُراسلہ، مُجاہدہ، تکملہ، تجربہ، تبصرہ، تسمیہ وغیرہ۔

(ب) اور اگر وہ اُردو میں ت سے لکھے جاتے ہیں تو مؤنث ہوں گے، مثلاً: مُرافعت، مُشاورت، مُتقاربت، تولیت، تعزیت، تہنیت وغیرہ۔

یہ اصول عربی کے اور اسماء پر بھی صادق آتا ہے، مثلاً محبّت، رویت، قُربت، مذمت، شوکت، قُدرت، محنت وغیرہ مؤنث ہیں، مگر شعبہ، تتمہ، کِفایہ، خزینہ، وغیرہ مذکر ہیں۔

بلکہ ایک ہی لفظ اگر ت سے لکھا جائے تو مؤنث اور ۃ سے لکھا جائے تو مذکر ہو جاتا ہے، مثلاً:

معاشرت مؤنث ہے، مگر معاشرہ مذکر
کفایت 〃 〃 〃 کفایہ 〃
تعزیت 〃 〃 〃 تعزیہ 〃

یاد رہے کہ یہ الفاظ عربی ہیں گول ت (ۃ) سے لکھے جاتے ہیں، جو متحرک ہونے پر ت کی آواز دیتی ہے اور ساکن ہونے پر ہ کی مگر اُردو میں اس طرح کے جو لفظ بھی آ گئے ہیں وہ یا تو صرف ت سے لکھے جاتے ہیں یا صرف ۃ سے، اور جو لفظ دونوں طرح لکھے جاتے ہیں، ان کی دونوں شکلوں کے معنوں میں بھی عموماً خفیف سا فرق آ جاتا ہے۔

۳۔ تَفْعِیل کے وزن پر آنے والے مصادر مثلاً تعریف، تسبیح، تقدیس، توحید، تنظیم وغیرہ مؤنث ہیں۔ صرف ایک مصدر تعویذ مذکر ہے (غالباً ایک آدھ مصدر اور مذکر ہے، جو اِس وقت مستحضر نہیں۔)

مذکر اور مؤنث اسماء کی فہرست (بہ ترتیبِ تہجی)

مذکر اسماء:۔ اخبار، اصطبل، اُگال، الاؤ، انتظار، انجن، اُون، بلاق، (ناک میں پہننے کا ایک زیور) پارسل، پرہیز، تار، ٹکٹ، جوش، خنجر (اس کی مؤنث خنجری ہے) خواب، درد، دھار (ہندی میں مؤنث) دینار، دہی، ڈونگا، راستہ (پارسا)، رس، ریشم، سنڈاس، طفیل، طوطی، ضمیر (نفس امارہ) غار، فائر، فوٹو، قبض، قلم، (لکھنے والا)۔ کاجل، کرنٹ، کورٹ، کھیل، گال (بمعنی رخسار)، لالچ، مرض، مرہم، موم، میچ، میدا، نکڑ، ہوش۔

مؤنث اسماء:۔ اٹکل، ادرک، اطلس، آواز، بیخ، پنشن، پیاز، ترازو، توند، ٹال، ٹکسال، جیب، جھاڑو، چلم، چھت، چین، دھوپ (بمعنی تپش) راہ، رَو (بمعنی بہاؤ یا کرنٹ) سائیکل (اور بائیسکل) ضمیر (قواعد کا ایک اسم) قلم (پودے کا تراشہ) کوچ، کیچڑ، موٹر سائیکل، نب، واسکٹ (اور جاکٹ)، میز۔

ان کے علاوہ بعض اسماء کو مذکر اور مؤنث دونوں طرح بولا اور لکھا جا سکتا ہے۔ ان میں سے بعض یہ ہیں:۔

اپیل، بُھس، برف[۱]، بلبل، پال (کچے پھلوں کو پکانے کا طریقہ) جیل، سانس، سائنس (آج مذکر متروک ہے) سگریٹ (مذکر فصیح تر ہے) طرز (مؤنث فصیح تر ہے) کاگ (یا کارک) کلاس، قمیص (مذکر بہتر ہے) لُغت، موٹر، مات، نقاب۔

---

[۱] دہلی اور لکھنؤ میں تو برف مؤنث ہے مگر روہیلکھنڈ میں قدرتی برف (Ice) کو مؤنث اور مصنوعی برف (Snow) کو مذکر بولتے ہیں۔

چوتھا باب

اِصلاحِ تلفّظ

تلفظ اور املا کے بارے میں میرے خیالات اس موضوع پر آج تک کے تمام لکھنے والوں سے مختلف ہیں۔یا، دوسرے الفاظ میں، میں نے کوشش کی ہے کہ اُردو کے ابتدائی زمانے سے لے کر آج تک جتنے علمائے اس پر اظہار رائے کیا ہے، ان سب کے مفید ترین خیالات جمع کر لیے جائیں، اس سے قبل اس کے کہ میں الفاظ کے صحیح اور غلط تلفظ کی فہرست پیش کروں، یہ نہایت ضروری معلوم ہوتا ہے کہ تلفظ کی صحت اور عدم صحت کے بارے میں اپنا نقطۂ نظر تفصیل کے ساتھ واضح کر دوں۔

جہاں تک دیسی ہندوستانی الفاظ کا تعلق ہے، اُردو میں اُن کے تلفظ کے بارے میں سب متفق ہیں کہ وہ جس طرح بولے جاتے ہیں یا جس طرح لُغت میں لکھے ہوئے ہیں اُسی طرح صحیح ہیں۔اِسی طرح انگریزی، ترکی، پُرتگالی وغیرہ کے جو الفاظ اُردو میں جس طرح رائج ہیں، صحیح ہیں، سارا اختلاف اور جھگڑا عربی اور کچھ فارسی الفاظ کے تلفظ پر ہے، کیونکہ ان کے الفاظ میں سے بہت سے ایسے ہیں کہ جن کا اصل زبان میں تلفظ کچھ اور ہے اور اُردو میں کچھ اور حالانکہ تمام عربی اور فارسی الفاظ جو اُردو میں مستعمل ہیں، مل کر اُردو لُغت کا بمشکل چوتھائی حصہ بنتے ہیں۔پھر کیا ان کا اصل تلفظ درست ہے یا وہ جو اُردو میں رائج ہے۔؟

اِس کے جواب میں دو نظریے پیش کیے جاتے ہیں۔ ایک طرف فارسی و عربی کے علماء و فضلاء ہیں جو اصرار کرتے ہیں کہ ان زبانوں کے الفاظ کا اصل تلفظ ہی صحیح ہے، اور اُردو میں جو رائج ہو چکا ہے وہ غلط ہے۔ دوسری طرف وہ موجودہ تعلیم یافتہ گروہ ہے جو اُردو میں رائج شدہ تمام الفاظ کے تلفظ کو صحیح مانتا ہے، خواہ اصل زبان کے اعتبار سے وہ تلفظ غلط ہو۔

میرا ذاتی رجحان دوسرے گروہ ہی کی طرف ہے، کیونکہ اُن کی دلیلیں بہت قوی ہیں، یعنی ایک زبان جب تک مکمل نہ ہوئی ہو، دوسری زبانوں کی محتاج اور پیرو ہوتی ہے، لیکن جب وہ پوری طرح ادبی اور علمی زبان بن جاتی ہے تو اپنے الفاظ کے تلفظ، املا اور معنی کے اعتبار سے مکمل آزاد ہو جاتی ہے۔ اس کی بڑی اچھی مثال انگریزی زبان کی ہے۔ آج سے چھ سات سو سال پہلے انگریزی نہایت ادنیٰ درجے کی زبان تھی، جسے شرفاء تحریر میں لاتے ہوئے بھی شرماتے تھے۔ اعلیٰ سوسائٹی کی تہذیبی زبان فرانسیسی تھی، اور اہلِ علم کی زبان لاطینی۔ اُس وقت انگریزی کی جو تحریریں ملتی ہیں وہ آجکل کی انگریزی سے بہت مختلف ہیں۔ اُن میں الفاظ کے ہجّے اور تلفظ میں فرانسیسی اور جرمن زبانوں کی پیروی کی ہوئی معلوم ہوتی ہے لیکن جب انگریزی خود ادب و انشا کی زبان بن گئی تو اس نے ہر بیرونی زبان کے اثر سے خود کو آزاد کر لیا۔ پس اسی طرح اُردو کے تلفظ میں بھی جو بیرونی رُجحانات ہیں اُنھیں نظر انداز کر کے اُسی تلفظ کو مستند ماننا چاہیے جو اُردو کے اہلِ زبان کا ہے۔

لیکن ان دلیلوں کی یہ بُنیاد نہ پوری طرح واضح ہے نہ مکمل۔ پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اہلِ زبان کسے کہتے ہیں؟ صوبے اور شہر کو بھی جانے دیجیے، خود ایک ہی شہر میں مختلف قسم کے لوگوں کی زبان مختلف ہوتی ہے۔ ایک طرف

اَن پڑھ عوام ہیں، دوسری طرف اوسط، تعلیم یافتہ طبقہ ہے، تیسری طرف شرفاً اور خاندانی رئیس ہیں، اور چوتھی طرف عالموں فاضلوں کی جماعت ہے۔ ان چاروں طبقوں کی زبان میں تھوڑا بہت اختلاف پایا جاتا ہے۔ پھر کس کی زبان اور کس کے تلفظ کو سند سمجھا جائے؟ ان کے علاوہ، آج ہم جس لفظ کا ایک طرح تلفظ کرتے ہیں، آج سے سو سال پہلے کسی مستند اہلِ زبان شاعر نے اس کا تلفظ کچھ اور طرح شعر میں باندھا ہے۔ پھر کیا ہم آج کے ہزاروں اَن پڑھوں کا تلفظ صحیح مانیں، یا آج سے سو سال پہلے کے ایک شاعر کا؟

اِس سوال کا صحیح اور واضح جواب آج تک کسی نے تسلی بخش نہیں دیا۔ مولانا حالی نے کچھ کوشش کی ہے، مگر وہ بھی پوری طرح صحیح نہیں ہے۔ یہاں ہم اس کا جواب دینے کی کوشش کرتے ہیں، شاید قابلِ اطمینان ہو۔

کوئی زبان جس وقت تک بولی کی حد تک رہتی ہے، یعنی تحریر میں نہیں آتی، اس وقت اس کے بولنے والے تین گروہوں میں بانٹے جا سکتے ہیں:-

پہلا گروہ اَن پڑھ عوام کا ہوتا ہے۔ ان کی تعداد سب سے زیادہ لیکن الفاظ کا سرمایہ سب سے کم ہوتا ہے، کیونکہ ان کی ضروریاتِ زندگی اور خیالات ہی بہت محدود ہوتے ہیں۔ لیکن یہی مختصر سا سرمایۂ الفاظ گویا زبان کی بنیاد ہوتا ہے۔ ان کا تلفظ جس طرح عوام کریں، وہی صحیح ہوگا۔

دوسرا گروہ متوسط طبقے کے معمولی تعلیم یافتہ لوگوں کا ہوتا ہے۔ یہ تعداد میں عوام سے کم، لیکن اِن کی لغت کا سرمایہ عوام سے زیادہ ہوتا ہے۔ کیونکہ ان کی ضروریاتِ زندگی اور خیالات عوام سے زیادہ وسیع ہوتے ہیں۔ یہ دوسری زبانوں سے ضروریات کے الفاظ اپنی زبان میں داخل کرسکتے اور کرتے رہتے ہیں۔ پس عوام سے جتنا زیادہ اور فالتو سرمایۂ الفاظ انھوں نے

زبان میں داخل کیا، اُس کے تلفظ کی سند عوام سے نہیں، اِنہی سے لی جائے گی۔
تیسرا گروہ اعلیٰ طبقہ شرفا، فاضل علما۔ اور شعرا، پر مشتمل ہوتا ہے۔ یہ لوگ تعداد میں سب سے کم، لیکن الفاظ کے اعتبار سے سب سے زیادہ مالدار ہوتے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جو زبان کو پھیلاتے اور گراں مایہ کرتے ہیں، انہی کی کوششوں سے زبان اس قابل ہوتی ہے کہ محض معمولی بولی سے بڑھ کر ادب اور شعر کی زبان بنے۔ اِنہی کے ذریعہ زبان میں طرح طرح کے نئے خیالات، انداز بیان، اسالیب بلاغت وغیرہ پیدا ہوتے ہیں۔ پس ظاہر ہے کہ عوام اور متوسط طبقے کے الفاظ کے علاوہ باقی پوری لغت پر اِنہی کو تصرف کا اختیار ہوگا اور اِنہی کا روزمرہ، محاورہ اور تلفظ مستند مانا جائے گا۔ لیکن اہل قلم کا ہمیشہ طریقہ یہ رہا ہے کہ وہ جہاں تک ہوسکے صحیح تلفظ ادا کرتے ہیں، لہٰذا زبان کے اُس دور میں جب وہ لوگ دوسری زبانوں کے الفاظ اپنی بول چال میں داخل کرتے ہیں، تو ان الفاظ کا اصلی اور صحیح تلفظ برقرار رکھنے کی کوشش کرتے ہیں، خصوصاً ایسی زبانوں کے الفاظ کا، جن سے اُن کو سیاسی یا مذہبی وجوہ کی بنا پر عقیدت یا محبت ہوتی ہے، صحیح تلفظ قائم رکھنے میں انھیں بڑا اہتمام ہوتا ہے۔ ایسی زبانیں انگریزوں کے لیے یونانی اور لاطینی تھیں، ہندوؤں کے لیے سنسکرت ہے اور مسلمانوں کے لیے فارسی اور عربی ہیں (فارسی کی وقعت اب اتنی نہیں رہی) چنانچہ یہ قومیں جب ان زبانوں کے الفاظ اپنی زبانوں میں داخل کرتی ہیں تو اُن کی کوشش ہوتی ہے کہ ان کا صحیح تلفظ برقرار رہے۔
یہاں ایک بار پھر سمجھ لیجیے کہ یہ کام صرف علما، و شعرا ہی کرتے ہیں اور اگرچہ زبان پر اُن کا بڑا احسان ہوتا ہے، مگر ظاہر ہے کہ عوام کے تلفظ پر اُنھیں کوئی اختیار نہیں ہوتا۔

اس کے بعد زبان دوسرے مرحلے میں داخل ہوتی ہے۔ یہ تحریر کا مرحلہ ہے، یعنی اب زبان اس قابل ہو جاتی ہے کہ اُس کا ادب تحریر میں لایا جا سکے۔ اس موقع پر پوری زبان میں الفاظ جس طرح رائج ہیں اُسی طرح، اُوپر کے مرحلے کی ترتیب کے مطابق لکھے جاتے ہیں۔ یعنی عوامی بول چال کے الفاظ چونکہ تینوں طبقوں میں یکساں بولے جاتے ہیں، اس لیے وہ ویسے ہی لکھے جاتے ہیں اور اعلیٰ طبقے کے الفاظ اُن کے تلفظ کے مطابق۔ ظاہر ہے کہ یہی طریقہ سب سے مناسب ہو سکتا ہے۔

یہ وہ وقت ہوتا ہے جب زبان کے پاس ایک دستاویز آ جاتی ہے، یعنی تحریر۔ اور چونکہ تحریری کام دیرپا ہوتا ہے اس لیے زبان کے بولنے والوں کے الفاظ، محاورے، تلفظ وغیرہ جتنی جلد بدلتے ہیں، تحریر میں اُتنی جلد تبدیلی نہیں آسکتی، پس اس وقت تلفظ متعین کرنے کا حق اعلیٰ طبقے ہی کا ہوتا ہے، کیونکہ اوّل تو عوام لکھنا نہیں جانتے، دوسرے زبان بولنے والوں میں آپس میں جو اختلافات ہوتے ہیں، اُن کو مٹا کر ایک مشترک زبان پر متحد کرنے کا کام بھی عوام نہیں کر سکتے۔ خود عربی میں بھی قرآن کے لکھے جاتے وقت یہی ہوا ہے۔ یعنی، سارے عرب میں زبان کے بےشمار اختلافات کو نظر انداز کر کے قریشِ مکّہ کی زبان مستند مانی گئی اور انہی کے روزمرے کے مطابق قرآن لکھا گیا تاکہ پورا عرب اس کی زبان پر متحد ہو جائے۔ یہی حال اُردو کا ہے۔ یُوں بولنے کو اُردو دہلی کے آس پاس بڑے علاقے میں بولی جاتی تھی، مگر جگہ جگہ کی زبان میں بہت سے اختلافات تھے، اور آج تک ہیں، مگر تحریری زبان ہر جگہ کی تقریباً ایک ہی ہے۔

اب زبان کا تیسرا مرحلہ آتا ہے، یعنی اُوپر کے طبقے کے ذریعہ جو نئے نئے بیرونی الفاظ زبان میں آتے جا رہے تھے، وہ رفتہ رفتہ اسی طبقے کی

بدولت نچلے طبقوں میں مقبول ہوتے جاتے ہیں اور ان کو عوام و خواص اپنی بول چال میں بے تکلف بولنے لگتے ہیں۔ اس موقعے پر تلفظ کے اعتبار سے بہاؤ کا رُخ اُلٹا ہو جاتا ہے یعنی اب بیرونی الفاظ کے تلفظ کی صحت و عدم صحت کی سند خواص سے عوام نہیں لیتے بلکہ عوام سے خواص لیتے ہیں، کیونکہ اب یہ بیرونی الفاظ بیرونی نہیں رہتے، بلکہ روزمرہ کی گفتگو میں اتنے رچ بس جاتے ہیں کہ عوام اپنی زبان کے الفاظ کی طرح اُن کو بھی اپنے لب و لہجہ کے مطابق بنا لیتے ہیں اور پھر خواص بھی اسی طرح بولنے لگتے ہیں۔ واضح رہے کہ یہ صورت صرف اُن الفاظ کے بارے میں ہوتی ہے جو عوام کی بول چال میں بھی آ گئے ہوں۔

اس موقعے پر عوام و خواص میں ایک کشمکش کا آغاز ہوتا ہے۔ عوام تو زبان کو اپنے تلفظ کی رُو سے آسان بنانا چاہتے ہیں اور ہر لفظ کو اپنے صوتی نظام کے مطابق کرنا چاہتے ہیں مگر خواص خصوصاً خاندانی شرفا کا طبقہ، جسے اپنی شستہ اور شیریں زبان پر بڑا ناز ہوتا ہے اور وہ اس کو بیرونی "خرابیوں" کے اثرات سے پاک رکھنے کی برابر کوشش کرتا رہتا ہے، اس تلفظ پر اصرار کرتا ہے جو کتابوں میں لکھا ہوا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یہ چھوٹا سا طبقہ اپنی زندگی اور قوت تک تو زبان کو ترقی کی راہ پر چلانے سے روکتا رہتا ہے لیکن ایسے لوگوں کی تعداد اوّل تو یوں بھی تھوڑی ہوتی ہے (پھر بھی چونکہ اس کا اقتدار اور تسلط عوام پر ہوتا ہے اس لیے عوام اسی کی زبان سے سند پکڑتے ہیں) اور جب زمانے کے گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کی تعداد اور طاقت گھٹتی جاتی ہے تو اس کی کلاسیکل زبان بھی معدوم ہو جاتی ہے اور عوام میں سے ایسے لوگ اُٹھتے ہیں جو علم اور شعر میں کام کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان کی زبان بھی عوامی ہوتی ہے اور تلفظ بھی۔ لہٰذا اب یہ لوگ زبان کو عوامی

تلفظ کی راہ پر لے آتے ہیں۔ آپ کو حیرت ہوگی کہ میرے مطالعے میں جتنی زبانوں کی تاریخ آئی ہے، سب میں بعینہٖ یہی بات اور اسی ترتیب کے ساتھ ملتی ہے۔ سنسکرت، پالی، اَپ بھرنش، عربی، لاطینی، یونانی، انگریزی اور اُردو سب کا یہی حال ہے۔ ان میں سے بعض زبانیں اسی عوام و خواص کی کشمکش میں بالکل ہی فنا ہو گئیں، یہاں تک کہ اب ان کا کوئی بولنے والا نہیں رہا، اور بعض جو ضروریاتِ زمانہ کا زیادہ ساتھ دے سکتی تھیں، اپنی کلاسیکل حیثیت چھوڑ کر عوامی بن گئیں۔

لیکن یہ بھی واضح رہے کہ زبان کتنی ہی عوامی بن جائے۔ بہرحال روزمرہ کی بول چال سے کچھ نہ کچھ مختلف ضرور رہے گی، کیونکہ روزمرہ کی زبان میں بڑی تیزی سے تبدیلی آتی ہے۔ ایک محقق کے قول کے مطابق تیس سال کے اندر اندر بول چال کی زبان میں کچھ نہ کچھ فرق پیدا ہو جاتا ہے اور یہ فرق ایک صدی میں بہت نمایاں ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ عوام میں سے نکل کر اُوپر آنے والے ادیبوں کا طبقہ کتنا ہی ترقی پذیر اور ترقی پسند ہو، وہ اپنی تحریری زبان کو ہر تیس سال کے بعد بدلنے کی جرأت تو نہیں کرے گا۔ پس تحریری اور تقریری زبان کا یہ فرق کچھ نہ کچھ برابر رہتا ہے، البتہ اتنا نہیں، جتنا شرفا کی کلاسیکل اور عوام کی روزمرّہ زبان میں ہوتا ہے۔

اس فرق کا ایک اور سبب رسم الخط بھی ہوتا ہے۔ یہ بالکل کھلی بات ہے کہ کسی زبان کا بھی رسم الخط مکمل نہیں ہوتا۔ جس وقت رسم الخط ایجاد کیا جاتا ہے اُس وقت اُس کے بنانے والے اپنی دانست میں اس کو ہر طرح مکمل بناتے ہیں، مگر ظاہر ہے کہ تحریر ایک پائیدار چیز ہے، وہ جلد جلد بدلنے والی بول چال کی زبان کا ساتھ نہیں دے سکتی اور اُردو اس معاملے میں خاص طور پر بدقسمت

ہے۔ اس نے رسم الخط اختیار کیا فارسی نستعلیق، جو خود فارسی زبان کے لیے بھی ناکافی تھا اور اگرچہ اُردو والوں نے اُسے کچھ ترمیم کر کے اپنا کام چلانے کے لائق بنا لیا، لیکن پھر بھی اس میں بہت سے اور بڑے بڑے نقائص موجود ہیں، جن میں دو سب سے نمایاں ہیں۔ ایک نقطوں والے حروف کی کثرت، دوسرے اعراب کی قلت۔ اگر انگریزی لکھائی کی طرح اُردو بھی الگ الگ حروف میں لکھی جاتی اور اُس کے علیحدہ سے زبر، زیر، پیش وغیرہ لگانے کی بجائے مستقل حروف ہوتے جو ہر حال میں لفظ کا جُز ہونے کی وجہ سے لکھائی میں ضرور آتے تو ہماری مشکلیں بڑی حد تک دُور ہو جاتیں۔ مگر، اب ظاہر ہے کہ ہم کو کسی خاص لفظ کے متعلق جب تک پہلے سے نہ معلوم ہو کہ اس کا تلفّظ کیا ہے، ہم محض تحریر میں پڑھ کر اس کا تلفظ ہرگز نہیں معلوم کر سکتے۔ مثلاً محبّت پر جب تک زیر نہ لگایا جائے، ہمیں نہیں معلوم ہو سکتا کہ اصل عربی لفظ "مَحَبَّت" ہے اور اُردو میں "مُحَبَّت" (یعنی مَ پر پیش) غلط رائج ہے اور یہ بھی ظاہر ہے کہ اُردو اور فارسی بلکہ عربی میں بھی اعراب بہت ہی کم لگائے جاتے ہیں۔ لکھنے والوں کے پاس اتنا وقت کہاں کہ ہر حرف پر ساتھ ساتھ اعراب بھی لگاتے جائیں۔ خصوصاً پُرانے زمانے کے ادیب تو نقطے بھی بہت کم لگاتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ عوام میں ہزارہا الفاظ غلط رائج ہو گئے۔

تلفّظ کے بدلنے کا ایک اور بلکہ سب سے اہم سبب عوامی زبان کی "آسان پسندی" ہے۔ عربی اور فارسی کے جتنے لفظ اُردو میں بدل گئے ہیں، اُن میں بہت ہی تھوڑی تعداد ایسے الفاظ کی ہے جو لاعلمی اور جہالت کی وجہ سے بدلے ہیں۔ زیادہ تر یہ تبدیلی اس لیے ہوئی ہے کہ عوام نے ان الفاظ کو اپنے لب ولہجہ اور صوتی نظام (Phonetic System) کے مطابق ڈھال

کر اپنی زبان کے لیے آسان اور گوارا بنا لیا ہے۔ میں نے جتنا بھی "اُردو عوام" کی گفتگو پر غور کیا ہے۔ مجھ پر یہ بات صاف سے صاف تر ہوتی گئی ہے، کہ اُردو بولنے والے عوام کا صوتی نظام دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں سے آسان اور باقاعدہ ہے۔ اس معاملے میں عربی، انگریزی، فارسی جیسی زبردست زبانیں بھی اُردو کا مقابلہ نہیں کر سکتیں۔ میں نے اُردو کے صوتی اصول، اچھی طرح تحقیق کرکے ایک علیحدہ مقالے میں جمع کئے ہیں۔ یہاں چند سب سے اہم اور قطعی اصول پیش کروں گا۔

قصہ مختصر، اُردو اس وقت تیسرے مرحلے میں بہت آگے نکل چکی ہے اس کا کلاسیکی دور ختم ہو چکا ہے، یہ نہ صرف عوامی بن گئی ہے، بلکہ اپنی بعض خوبیوں کی بدولت ممالک ہندو پاک کی سرحدیں پھلانگ کر ہزار ہا میل دُور دُور تک پسندیدہ بن چکی ہے اور ان سب سے بڑھ کر یہ کہ ایک آزاد قوم کی زبان بن گئی ہے۔ جس کے لیے ضروری ہے کہ اس کے اصُول تلفّظ و تہجّی پر از سرِ نو نظر ہونی چاہیے، اور قدیم قواعد کو سینے سے لگائے رکھنے کی بجائے نئے قواعد مرتب کیے جانے چاہئیں۔ ان میں سے تلفظ کے یہ چند اصُول میری رائے کے مطابق پوری طرح صحیح ہیں :-

۱۔ فارسی و عربی کے جو الفاظ عوام و خواص دونوں کی بول چال میں اصل عربی تلفّظ سے مختلف ہو چکے ہیں، ان کا عربی تلفظ برقرار رکھنے پر اصرار کرنا نہایت زیادتی کی بات ہے۔ اب وہ فارسی عربی الفاظ نہیں رہے، نہ شرفا کی زبان کے لیے مخصوص رہ گئے ہیں۔ اب وہ عوام کی اُردو کے ہیں اور اُن کا تلفظ وہ صحیح ہے جو اُردو میں اب رائج ہے۔

۲۔ جو الفاظ خاص طور پر خواص کی زبان کے ہیں، اُن کا تلفّظ وہی درست

ہے، جو خواص بولتے ہیں، خواہ وہ اصل عربی یا فارسی زبان کی رُو سے غلط ہی ہو اور اگر اتفاق سے عوام اُن میں سے کوئی لفظ بولیں، اور اُن کا تلفظ اصل زبان کے مطابق ہو، تب بھی وہ غلط ہو گا مثلاً علاوہ کو ع پر زبر کے ساتھ بولا جاتا ہے۔ حالانکہ عربی میں یہ علاوہ (ع پر زیر) ہے۔ اب اگر عوام اسے عِلاوہ (ع پر زیر) بولیں تو غلط ہے ـــــ یہاں یہ بھی واضح رہے کہ اب اُردو بولنے والے صرف دو ہی طبقوں میں بانٹے جا سکتے ہیں: اَن پڑھ عوام اور شائستہ تعلیم یافتہ۔ آج کل ان کے سوا کوئی تیسرا یا چوتھا طبقہ موجود نہیں۔

۳۔ اگر تلفظ کے بارے میں عوام اور خواص میں اختلاف ہو تو صحیح تلفظ وہ مانا جائے گا جو اُردو کے صوتی اصولوں کے مطابق ہو گا یا اُردو کے صوتی مزاج کے قریب ترین ہو گا اور تجربہ کرنے پر معلوم ہو گا کہ ایسے موقع پر زیادہ تر عوام ہی کے تلفظ کے حق میں فیصلہ ہو گا۔

۴۔ عربی اور فارسی ناموں کا تلفظ عموماً برقرار رکھا جاتا ہے لیکن بعض صورتوں میں (یعنی جب وہ نام، زبان کے دوسرے الفاظ کی طرح اسمائے عام بھی ہوں) اُن کا تلفظ اسی طرح صحیح ہو گا، جس طرح روزمرّہ کی گفتگو میں آتا ہے۔ مثلاً رضا۔ اللہ میں رضا کی ر پر اصل عربی میں زیر ہے، یعنی رِضا۔ لیکن چونکہ یہ لفظ صرف ناموں کا جزو ہی نہیں، اپنے علیحدہ معنی بھی رکھتا ہے اور بول چال میں بھی آتا ہے۔ اس لیے اس کو رَضا۔ اللہ پڑھنا درست بلکہ لازمی ہے۔

۵۔ عربی الفاظ کے تلفظ کا اُردو میں بدل جانا صرف اِن تین صورتوں میں روا رکھا جائے گا:۔

(الف) عربی کی مخصوص آوازوں کا اُردو میں بدل جانا (یہ مخصوص آوازیں آٹھ ہیں۔ ان کی تفصیل آگے آتی ہے)

(ب) زبر، زیر، پیش، یعنی اِعراب کا بدل جانا (چنانچہ اگر اُردو میں کسی عربی لفظ سے الف گرا کر بولا جائے تو درست نہیں جیسے تاخیر کو کوئی شخص تخیر بولے تو غلط ہے)

(ج) اُوپر کی دونوں شقوں میں بیان کیے ہوئے اصُولوں کے علاوہ اُردو میں بعض ایسے الفاظ بھی عربی کے رائج ہیں، جن کے حروف بدل گئے ہیں۔ مثلاً تماشی سے تماشا، تمنیٰ سے تمنّا، اُستاذ سے اُستاد وغیرہ۔ ایسے الفاظ کا تلفّظ اگر اُوپر کے چاروں اصُولوں میں سے کسی ایک کے بھی مطابق ہو تو درست ہوگا۔

۶۔ بعض عربی، فارسی الفاظ ایسے ہیں، جن کا تلفّظ اصُول ۳ کے مطابق عوام کی زبان پر صحیح ہے، لیکن خواص کو اصرار ہے کہ ان کا عوامی تلفظ غلط ہے۔ ایسے الفاظ کے لیے اجازت دے دی جائے کہ دونوں طرح ٹھیک ہے اور عوامی شعراء کو خصوصاً چاہیے کہ قصداً ان الفاظ کا عوامی تلفظ اپنی شاعری میں باندھیں۔ رفتہ رفتہ وہی تلفظ مستند ہو جائے گا۔ ایسے لفظوں کی مثال یہ ہے:۔ نُسخہ کو نُخسہ، شوربا کو شُروا، مزاج کو مجاز وغیرہ عوام بولتے ہیں۔

ان اصُولوں میں آخری دو (۵ و ۶) نہایت اہم ہیں اور اِن پر اُردو کے اہلِ زبان حضرات مجھ سے ناراض بھی ہو سکتے ہیں۔ لیکن کیا کیا جائے، یہ دونوں اصُول نہایت منطقی بلکہ روادارانہ ہیں۔ اس سے زیادہ رعایت تعلیم یافتہ صاحبان کو نہیں دی جا سکتی کہ اُن کے اور عوام کے تلفّظ دونوں ہی صحیح تسلیم کر لیے جائیں۔ آگے چل کر، جب ان اصُولوں کے مطابق الفاظ کا عوامی تلفّظ ہی صحیح مان لیا جائے گا تب شاید اُن کی قدر ہو گی۔ سر دست یہ حضرات ہمّت

کریں۔ اور اسی طرح لکھنا بولنا شروع کر دیں، پھر دیکھیئے کہ کتنی جلد یہی تلفظ مستند ہو جائے گا۔

تنبیہہ یاد رہے کہ میں نے یہ اصول صرف تلفظ کے بارے میں منضبط کیے ہیں، املا کے لیے نہیں، اور اگرچہ جس طرح ہم بولتے ہیں اُسی طرح لکھنا بھی چاہیے، لیکن بعض الفاظ خصوصاً اصول ۵ کی پہلی شق کے تحت آنے والے الفاظ کا املا بدلنا میں بھی درست نہیں سمجھتا۔ مثلاً صاحب کو اُردو والے ساہب یا ساب بولتے ہیں، لیکن اس طرح لکھنا ہرگز ٹھیک نہیں، اس کی وجہیں کچھ دوسری ہیں، جن کا یہاں بیان مناسب نہیں۔ البتہ اگر اب کوئی مستند لغت مرتب کی جائے تو ایسے لفظوں کا تلفظ ظاہر کرنے کے لیے ضرور اس طرح لکھ دیا جائے۔ مثلاً یہی لفظ مع معنی اس طرح درج ہو:-

"**صاحب** (تلفظ: ساہب، ساب) سابقی، معزز کلمہ خطاب، یورپین لوگوں کو ہندوستانی ملاؤں کا دیا ہوا خطاب، عام گفتگو میں مخاطب کو خطاب کرنے کا کلمہ" وغیرہ۔

اب میں اُردو کے سب سے اہم اور جامع صوتی اصول درج کرتا ہوں۔ اُوپر آپ نے دیکھا ہوگا کہ تلفظ کے سلسلے میں میں نے صوتی اصولوں پر خاص زور دیا ہے کیونکہ ہر زبان کا ایک مخصوص صوتی مزاج ہوتا ہے۔ اُردو کے مخصوص صوتی اصول یہ ہیں:-

اُصول نمبر ۱:- عربی کے ساتھ مخصوص آوازیں اُردو میں نہیں آتیں۔ یہ آٹھ آوازیں ہیں (ابجد کی ترتیب سے اخذ کر کے): ح، ط، ع، ص، ث، ذ، ض، ظ، ق۔

ان میں سے ح کے بدلے ہ آتی ہے، جیسے حامد کا تلفظ ہامد ہے،

ط کے بدلے ت آتی ہے، جیسے طرف کا تلفظ ترف ہے؛
ع کے بدلے ہمزہ (یعنی الف) آتا ہے، جیسے عورت کا تلفظ اورت ہے (بعض دفعہ واو بھی آتا ہے، جیسے تمتع کا تلفظ تمتو ہے۔ غرض ع کی جگہ اردو میں حروفِ علت یعنی الف، واو، اور ی سے کام چلایا جاتا ہے۔)
ص اور ث کے بدلے س آتا ہے، جیسے صاف اور ثالث کے تلفظ ساف اور سالس ہیں۔
ذ، ض اور ظ کے بدلے ز آتی ہے، جیسے ذلیل، ضمیر، ظریف کے تلفظ زلیل، زمیر، زریف ہیں۔
یہ اصول ہر حال میں درست ہے۔ صرف بعض علما، اپنی پُرتکلف (بے تکلف نہیں!) گفتگو میں ص، ح، ع اور ث کا صحیح تلفظ کرنے کی کوشش کرتے ہیں، مگر گھر کی بے تکلف گفتگو میں وہ بھی نہیں۔

اصول نمبر ۲: اردو کا ہر لفظ حرکت سے شروع ہوتا ہے اور سکون پہ ختم۔ اس کی رو سے ایسے بیرونی الفاظ، جو سکون سے شروع یا حرکت پر ختم ہوتے ہیں، اُن کا تلفظ اس طرح بدلا جاتا ہے:۔
(الف) انگریزی (اور کچھ سنسکرت) کے جو الفاظ سکون سے شروع ہوتے ہیں، ان کا پہلا حرف متحرک کرلیا جاتا ہے، جیسے پلیٹ (Plate) کو پلیٹ (پ پر زبر)، ڈرائور (Driver) کو ڈرائور (ڈ پر زیر)، کرشن (ک ساکن) کو کرشن (ک پر زیر) وغیرہ۔
(ب) انگریزی کے س ساکن (سہ) سے شروع ہونے الفاظ سے پہلے الف مکسور لگایا جاتا ہے، جیسے (Station) سے اِسٹیشن (اسٹیشن

غلط ہے)، اسکول، اسٹوڈنٹ، اسپورٹ وغیرہ۔ البتہ اگر انگریزی الفاظ کے شروع میں (الیس ایل) ہو تو صرف س کو متحرک کر کے اس پر زیر لگاتے ہیں، جیسے سلیٹ (Slate) کو سِلیٹ اور سلوگن (Slogan) کو سِلوگن بولتے ہیں۔

اہلِ پنجاب عموماً ہر ایسے انگریزی لفظ کو، جو س ساکن سے شروع ہو، اُردو میں بھی س سے لکھنے اور بولتے ہیں، حالانکہ یہ اُردو تلفظ اور املا دونوں کے خلاف ہے۔ سکول، سٹوڈنٹ، سپورٹ، سکیم، سٹاپ، سٹارٹ وغیرہ سب کے شروع میں الف بڑھانا چاہیے اور اُس کو زبر سے پڑھنا چاہیے۔

(ج) عربی کے بعض الفاظ کا آخری حرف مُشدّد ہوتا ہے۔ تشدید کا مطلب ہی یہ ہے کہ ایک حرف برابر برابر دوبار استعمال ہوتا ہے، پہلی بار ساکن، دوسری بار متحرک، لہٰذا آخری متحرک حرف اُردو میں نہیں آسکتا، یعنی مشدد حروف کو ساکن کر کے پڑھا جاتا ہے، جیسے رَبّ، حَقّ، قطّ، مسّ، شقّ، شلّ وغیرہ کو ربْ، حقْ، قطْ، مسْ، شلْ بولا جاتا ہے، البتہ اگر یہ الفاظ مضاف یا معطوف ہوں تو ان کو مشدّد بھی پڑھ سکتے ہیں۔ کیونکہ اس صورت میں یہ ایک لفظ نہیں رہتے، بلکہ دو لفظوں کے مجموعے کا ایک جز ہو جاتے ہیں، جیسے ربِّ اکبر، حقّ زوجیت، حکّ و اصلاح، کرّ و فر وغیرہ مُشدّد درست ہیں، مگر لازمی نہیں۔

اصول نمبر ۳ :- اُردو میں دو یائے معروف یا دو واو معروف ایک ساتھ نہیں آسکتے۔ یعنی یِی کی آواز یا وُو کی آواز اُردو بولنے والوں کے لیے ثقیل ہے، یہ خالص عربی آوازیں ہیں۔ ایسے حروف جب آئیں تو ان میں سے پہلے کی جگہ ہمزہ آتی ہے، جیسے تایِید کو تائید اور داوُد کو داؤد بولتے ہیں (ی اور واو

دو طرح کے ہوتے ہیں۔ معروف اور مجہول۔ معروف ی کی آواز اس طرح ہے۔ جیسے تین میں اور مجہول، جیسے ایک میں۔ اسی طرح واو معروف کی آواز ایسی ہے۔ جیسے پھول میں، اور مجہول کی، جیسے چوٹ میں۔ پس اس اصول میں معروف اور مجہول کا فرق خاص طور پر یاد رکھیے۔ یعنی دو ی مجہول یا دو واو مجہول تو ساتھ ساتھ آسکتے ہیں، لیکن معروف نہیں۔)

اُصول نمبر ۴ :۔ اُردو میں دو ساکن حروف برابر برابر نہیں آسکتے۔

چنانچہ فکر، علم، قرض، وغیرہ جتنے الفاظ ہیں، اُردو بول چال میں اُن کا پہلا ساکن متحرک ہو جاتا ہے، یعنی فکَر، علَم، قرَض وغیرہ۔

اور جو الفاظ سْت یا شْت پر ختم ہوتے ہیں (ایسے الفاظ زیادہ تر فارسی کے ہیں) ان کی آخری ت کو عموماً گرا دیتے ہیں، جیسے دسْت پناہ کو دَس پناہ اور گوشْت کو گوشْ بولتے ہیں۔ لیکن یہ طریقہ زیادہ رائج نہیں، کیونکہ ایسے الفاظ کا تلفظ اہل زبان کے لیے زیادہ ثقیل نہیں ہوتا۔

اُصول نمبر ۵ :۔ اُردو میں تین متحرک حروف برابر نہیں آسکتے۔

چنانچہ کَلَمَہ کو کَلْمہ، رَمَضان کو رَمْضان، حَیَوان کو حَیْوان وغیرہ۔ نہ صرف اُردو بول چال میں آتا ہے بلکہ بہت سے شعرائے بھی ان کو اسی طرح باندھا ہے۔

اُصول نمبر ۶ :۔ اُردو تلفظ میں کوئی لفظ ہ پر ختم نہیں ہوتا۔ چنانچہ ایسے تمام الفاظ کی آخری ہ گرا دی جاتی ہے، مثلاً شاہ، یہ، وہ، روزہ، ذمّہ، مطالبہ، وغیرہ کو شا، یے، وُو، روزا، ذِمّا، مطالبا بولتے ہیں۔ یا آخری ہ

ؔ یہ اور وہ کا اِملا بھی قدیم اُردو میں یے اور وو تھا۔ میر انیس کے (باقی اگلے صفحہ پر دیکھیں)

کے آگے الف بڑھا دیتے ہیں، مثلاً نباہ، نگاہ، وجہ وغیرہ کو نبھا، نگھا، وجھا بولتے ہیں۔

یہ چھ اصول نہایت عام اور جامع ہیں، جو اُردو تلفّظ پر بہت اثرانداز ہوئے اور ہوتے ہیں۔ ان میں سے ایک آدھ کی شق کے سوا باقی سب کے سب، اُردو بولنے والے عوام و خواص کے تلفّظ پر صادق آتے ہیں اور میں عموماً تلفّظ کی صحت انہی اصولوں سے جانچتا ہوں۔ ان کے علاوہ اور بہت سے اصول ہیں مگر اتنے جامع نہیں، لہٰذا ان کو نظرانداز کر دیا گیا۔

اب میں تلفظ کے بارے میں مزید کچھ کہے بغیر بعض عام اور غلط متلفّظ الفاظ کی فہرست پیش کرتا ہوں۔

ذیل کی فہرست میں میں نے "صحیح تلفّظ" کے تحت جہاں جہاں الفاظ کے دو دو تلفّظ لکھے ہیں۔ وہاں پہلا تلفّظ زیادہ صحیح ہے، دوسرا کم۔ تشریحات جہاں مناسب معلوم ہوا، کر دی گئی ہیں :-

صحیح اُردو تلفّظ	اصل فارسی یا عربی تلفّظ
آتَش، آتِش	

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ سے آگے) غالب کی تحریر کا عکس میں نے دیکھا ہے، وہ اسی طرح لکھتے تھے۔ بلکہ غالب نے تو سو، لکھو، تُو کے ساتھ دو کا قافیہ بھی باندھا ہے۔

کہتے تو ہو تم سب کہ بُتِ غالیہ مُو آئے
اک مرتبہ گھبرا کے کہو کوئی کہ وہ آئے

(مشہور غزل)

آخِرَت (خ پر زیر)	
آخِرکار (خ پر زیر یا ر ساکن)	آخِرکار
آخِری ۔ آخْری	
آزُردہ ۔ آزُردگی	آزُردگی
اَنِیس (ایک شاعر کا تخلص۔ اُنِیس غلط ہے)	
اَسامی، آسامی	اَسامی
اَٹھّارہ (ٹھ مُشدّد)	
اِخوان (اَخ بمعنی بھائی کی جمع)	
اَدْوِیَہ (دوا کی جمع ۔ ادویات غلط ہے)	
اَرَسْطُو، اَرِسطو (ایک یونانی حکیم)	اَرِسطُو
اِزْدِحام، اژدحام	اِزْدِحام
اَساتِذہ (اُستاذ کی جمع)	
اُقْلِیدَس، اُقلِیدِس	اُقلِیدِس
اِقْلِیم	
اَکابِر (اکابرین غلط ہے)	
اِکاوَن، اکیاوَن (۵۱)	
اِکلَوتا	
اِلائچی، اِلاچی	اِلاچی
اَلْف (بمعنی ہزار، اَلِف غلط ہے)	
اَلِف (تہجی کا پہلا حرف)	
اَلوَداع، اَلوِداع	اَلوَداع

اَمرِت ، اِمرَت	اُمرت (سنسکرت)
اُندلُس	اَندَلُس
اِنکِسار	
اَہمیّت ، اَہمیَت	اہمیّت
باہَر	
بُچَت (چ مشدّد نہیں)	
بَدرَقہ (ق مشدّد نہیں)	
بِشارت ، بُشارت	بِشارت ، بُشارت
بضاعت	
بَگولا (ب پر زبَر)	
بِل بُوتا (واؤ معروف)	
بَوچھاڑ (ب پر زبَر)	
بھانجا (ن غنہ غلط ہے)	
بَہبُود	
بَہن ، بَہَن	
بھَونچکّا (بھ پر زبر اور ن غنہ) ، بھَوچکّا	
بھینٹ (ی مجہول اور ن غنہ)	
بَیساکھ (ب پر زبر) بَیساکھی	
بے وَقوف	بے وُقوف (واؤ پر پیش)
پانچ	
پائے تخت	

پچانوے (ج مُشدّد)	
پچھواڑا	
پریشان (ی مجہول و معروف دونوں صحیح ہیں)	
تالاش، تلاش	
تبادلہ (دال ساکن)	تبادُل
تجزیہ، تجربہ	تجربہ
تخلیہ (ی مُشدّد غلط ہے)	
تشنہ، تشنہ	
تعداد (ت پر زیر غلط ہے	
تفاوت (واو پر زبر غلط ہے)	
تقرّر (تقرری بالکل غلط ہے)	
تلازمہ	تلازُم
تنازُع (ز پر زبر غلط ہے اور تنازعہ بھی غلط ہے)	
توبہ	
تزک	
تیمور، تیمور	تیمور
تیور (ی مجہول)	
تانگہ (طانگہ غلط ہے)	
ٹسوے (بمعنی آنسو)	
ٹھاکردوارہ	
ٹیٹوا، ٹینٹوا (ی مجہول)	

جِبِلَّت	
جِدّ و جَہد ، جَدّ و جَہد	جِدّ و جُہد[۱]
جُزْ (واو بڑھانا غلط ہے ، سوائے اضافت کے ، جیسے جُزوِ بدن)	
جِزْیَہ	
جَناب	
جُمْہور	
جُھٹ پُٹا	
چُڑکا	
چِکنا چُور	
چُنگل ، چَنگل	
چھُپکلی ، چھِپکلی	
چُہَل	
حجم	
حَشمت	حِشمت
حَسِین (بمعنی خوبصورت ، حُسین غلط ہے)	
حَوصلہ	حَوصلہ
خَدِیجہ	

[۱] اکثر لوگ اِس کو آج کل "جِدّ و جُہد" لکھنے لگے ہیں ، لیکن "جُہد" ایک بالکل مختلف لفظ ہے ، جو یہاں لانا درست نہیں ۔

خطِ اِستِوا	
خَلوت	
خودکُشی	
خُرد (خورد غلط ہے)	
خیر مَقدَم	
ڈاڑھ ، داڑھ	
ڈاڑھی ، داڑھی	
دائم المَرض (دائم المریض غلط ہے)	
دَبیل، دَبیل (ی مجہول)	
دُرُخشاں	
دُکان	دُکّان
دُوَل (دولت کی جمع)	
دِہش	
دَیجُور	
ذِمّہ (ذ پر پیش غلط ہے)	
ذِمّہ داری ، ذمّہ داری (دو اور دواو دونوں طرح درست)	
رَجَب	
رُجحان (پہلے جیم، پھر ح)	
رَعیّت	
رَقابت	
رَوِش	

زِراعت	
زُلیخا ، زَلیخا	زَلیخا
زمین دار	
ساغر	
سُپُرد ، سَپُرد	سَپُرد
سِپہر ، سِپِہر	سِپہر
سجُدہ	
سِفارش ، سُفارش	
سُفوف ، سَفوف	سَفوف
ساکن (جمع : سکنہ)	
سلُوٹ	
سَمَندر (سَمُندر ہندی تلفظ ہے[1])	سَمُندر (سنسکرت)
سُموم ، سَموم	سَموم
سَوت (بمعنی سوکن)	
سوتیلا (ی مجہول)	
سان گمان (ش غلط ہے)	
شرَف (ر پر زبر)	
شرِیان (ایک قسم کی رگ)	
شمِلہ (پگڑی کا سرا)	

[1] قیاساً سُمُندر بھی غلط ہے۔

شَغَل (ش پر زبر، شُغل غلط ہے)	شُغْل (مصدر) شُغَل (اسم جمع)
صَحابہ (ص پر زیر غلط ہے)	
صاحَب، صاحِب	
صَفحہ (ص پر پیش غلط ہے)	
ضَرُور، ضَرُور	ضَرُور
ضَرورت، ضُرورت	
طَرَف (ر پر زبر)	
طَلَبہ (طالب کی جمع)	
عافیَت (ی مشدّد غلط ہے)	
عَروض (شاعری سے متعلق ایک علم)	
عُشرِ عَشیر (پہلے عین پر پیش)	
عِصمت (ع پر زیر)	
عِطر (ع پر زیر)	
عَلانیَہ	
عَلاوہ، عِلاوہ	عِلاوہ
عَمَدًا، عَمْدًا	عَمْدًا
عَمرو (واو نہیں پڑھا جاتا)	
عَندَلیب	
عَنقا، عُنقا	عَنقا
عُوج بن عُنُق (ایک نام[1])	

[1] صاحب "اصلاحِ تلفظ" نے عوج بن عوق صحیح لکھا ہے (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر دیکھیں)

غَرَض (ر پر زبر)	
غرضکہ (غرضیکہ غلط ہے)	
غَلَط (ل پر زَبَر)	
غَلَطی، غَلْطی	
غُصِیلا، غُصِیل	
غَیُور (غ پر پیش یا ی مشدّد غلط ہے)	
فَضا، فِضا	فَضا
فُغاں (ف پر پیش)	
قُضَاۃ، قُضَاتؔ[1] (ض مشدّد غلط ہے)	
قِبطی (مصر کی قدیم قوم)	
قُبول، قَبول	قَبول
قُدوم (قدم کی جمع نہیں)	
قُریشی، قُرَیشی	
قُسطُنطُنیہ	قُسطَنطِنیہ
قَلعہ، قِلعہ	قَلعہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ سے آگے) مگر اہلِ زبان اسے عُوج بن عُنُق ہی بولتے ہیں۔ یہ لفظ صرف نام ہی نہیں، اُردو میں ایک علامت ((Symbol)) سا بن گیا ہے۔ ظفر دہلوی کہتے ہیں:

پیدا کیا وہ اُس نے بشر عوج بن عُنُق ۔ پُل جس کی ساقِ پا سے بنا رودِ نیل کا

[1] قاضی کی جمع۔

قمیص (ض غلط ہے)
گرہ (ر مشدد نہیں)
کشنیز (بمعنی دھنیا)
کنارہ، کَنارہ
گنبد (ذ نہیں)
گھایل، گھایَل
لآلی (لُولُو بمعنی موتی کی جمع)
مُبارَک، مُبارِک
مَبادا (م پر پیش غلط ہے)
مُتَرجِم (ج مشدد غلط ہے)
مُتَواضِع (ض پر پیش غلط ہے)
مُتَوَجِّہ (ج پر زیر)
مُتَوَفّیٰ (مرنے والا - آخر میں الف پڑھا جاتا ہے)
مُجاوِر (و پر زیر)
مُجرِم (ر پر زیر)
مُحال (م پر پیش)
مُحِبَّت، مَحَبَّت

مَحَبَّت (درست ہے)

مُخاطِب (خطاب کرنے والا)
مُخاطَب (جسے خطاب کیا جاتا ہے)
مَدرَسہ (ر پر زبر)
مِدحت (م پر زیر)

مَرثِیَہ (ی مشدد غلط ہے) مَرجان (م پر زبر) مُرَوَّت مَرَمَّت (مُرَمَّت غلط ہے) مَسافت (م پر زبر) مَسجِد (ج پر زیر) مُسَرَّت (م پر زبر) مُسَمّٰی، مُسَمّیٰ مُسَوَّدَہ مُطلَق (ل پر زبر) مُطَّلَع (جسے اطلاع دی جائے) مُعَنوَن (مُعَن وَن) مُعَمّا (پہلی م پر پیش) مُلزَم (جس پر الزام ہو۔ ز پر زبر) مَلکہ، مَلِکَہ (بمعنی بادشاہ بیگم، نیز بمعنی مہارت) مَنزِل (ز پر زیر) مِنطَقَہ مَیکا (بمعنی عورت کے ماں باپ کا گھر)	مُسمّٰی (نام رکھا گیا) مَشعَل [۱] مَلکہ (بمعنی مہارت)

[۱] بعض حضرات کو اصرار ہے کہ یہ لفظ "مِشعل" (میم پر زیر) ہے۔ لیکن عربی میں مِشعل کے معنی بالکل مختلف ہیں۔ صحیح لفظ (اور وہی) "مَشعل" ہے جو عوام میں رائج ہے۔

ناواقِفیّت ، ناواقِفیَت (ناواقفی غلط ہے)	
نِچلا (ن پر زیر اور چ ساکن)	
نُکات ، نِکات (نکتہ کی جمع)	نِکات
نَگہُت ، نَکہَت	
نُما (مثلاً قُطب نُما)	
نَماز (ن پر زیر غلط ہے)	
نُمائش	
نُمایاں	
نِنّانوے (دوسرا نون مشدّد ہے)	
نَیل مَرام (ن پر زبر)	
واوَیلا (دونوں واو زبر کے ساتھ)	
وِداع ، وَداع ۔	وَداع
وَقار ، وِقار	وَقار
وُقعت	
ہَتک (ت مشدّد غلط ہے)	
ہراوَل (ہ پر زیر)	
ہمہ گیری (ہمہ گیریت غلط ہے)	
ہَل چَل (ہ اور چ دونوں پر زَبَر)	
یَثرِب (مدینہ منوّرہ کا نام ، ر پر زیر)	
یکسانی (یکسانیت غلط ہے)	
یگانگی ۔ یگانگت	

یُورِش یُوسُف ع (یوسَف غلط ہے) یُونُس ع (یُونَس غلط ہے)	یُرُوش (یُورُش)

ان کے علاوہ کچھ مزید الفاظ کے تلفظ کے بارے میں لکھا جاتا ہے۔

عربی مصادر

(۱) فَعْل ، فِعْل اور فُعْل کے وزن پر آنے والے مصادر :-

یعنی وہ مصدر جو تین حرف کے ہوں، اور اُن کے آخری دونوں حرف ساکن ہوں۔ ان میں سے عوامی بول چال کے تمام مصادر کا حرفِ اوسط (یعنی دوسرا حرف) متحرک ہوجاتا ہے۔ یہ حرکت ہمیشہ زبر ہوتی ہے۔ البتہ علماً کی گفتگو کے ساتھ مخصوص مصادر جوں کے توں رہتے ہیں۔ لہٰذا ان عوامی گفتگو کے مصادر کا تلفظ وہی زیادہ صحیح ہے جو عوام کا ہے۔ خواص کا تلفظ بھی صحیح شمار کیا جاسکتا ہے۔ یہ عوامی بول چال کے مصادر حسبِ ذیل ہیں :-
ہَرَج ، جَرَح ، ذِبَح[1] ، شَرَح ، طَرَح ، فَتَح ، مَسَح ، صَبَر ، غَدَر ، مَکَر ، عَرَض ، فَرَض ، قَرَض ، شَرَط ، جَمَع ، دَفَع ، نَزَع ، رَفَع ، وَضَع ، حَذَف ، حَلَف ، فَرَق ، دَخَل ، عَقَل ، فَضَل ، قَتَل ، خَتَم ، ہَضَم ، ذِکَر ، فِکَر ، حِرَص ، حِفَظ ، عِلَم ، فِقَہ ، شُکَر ، عُذَر ، کُفَر ، حُکَم ، ظُلَم ، شُغَل ——

۲- فَل کے وزن پر آنے والے مصادر، یعنی جو بظاہر دو حرفی ہوں اور

---

[1] اصل عربی ذَبَح (ذ پر زبر) ہے، مگر اردو میں عموماً ذ پر زیر کے ساتھ بولا جاتا ہے۔

آخری حرف مشدد ہو۔ ان تمام مصادر کی تشدید گر جاتی ہے، جیسے :۔
شقّ ، شلّ وغیرہ کو شَق ، شَل بولا جاتا ہے۔
البتہ جن الفاظ کا آخری حرف "ر" ہو ، اُسے مشدد پڑھ سکتے ہیں، مثلاً
کرّو فرّ ۔ یہ اس لیے کہ ر کی تشدید اُردو بولنے والوں کی زبان پر ثقیل نہیں ۔
۳ ۔ فَعْلۃ کے وزن پر آنے والے (یعنی چارحرفی مصادر ، جن کا دوسرا حرف
ساکن ہو) :۔ یہ تمام مصادر بالکل عربی تلفظ کے مطابق بولے جاتے
ہیں ، سوائے دو لفظوں کے ، رِفْعَت (ر پر زیر) کو رُفعت بھی بولتے
ہیں اور نیّت (ی مشدد) کو نِیَت (ی پر صرف زَبَر) بولا جاتا ہے
اس لیے یہ دونوں تلفّظ بھی ٹھیک ہیں۔
۴ ۔ فَعَلۃ کے وزن پر آنے والے مصادر کا (یعنی وہ چار حرفی لفظ جن کے
پہلے تینوں حرف متحرک ہوں) دوسرا حرف اُردو میں ساکن ہو جاتا ہے،
جیسے حَرَکت ، بَرَکت ، غَلَبہ کو حَرْکت ، بَرْکت ، غَلْبہ بولتے ہیں ، اور یہی
ٹھیک ہے ۔
۵ ۔ فَعَال اور فِعَال کے وزن والے مصادر (پہلے حرف پر زیر یا زبر) اُردو
میں عربی تلفظ کے مطابق آتے ہیں ، سوائے جِوار (بمعنی پڑوس) کے ،
جو اُردو میں زَبَر سے آتا ہے ، یعنی جَوار ۔ ان کے علاوہ فُعال کا وزن
(پہلے حرف پر پیش) اُردو میں بہت کم آتا ہے ۔ اس میں سُوال
کو اُردو میں سَوال (س اور واو پر زَبَر) بولتے ہیں اور یہی صحیح ہے ۔
۶ ۔ فَعالہ اور فِعالہ (ف پر زَبَر یا زیر) کے تمام مصادر کا تلفظ اُردو میں
اسی طرح ہوتا ہے ، سوائے فَعالہ (ف پر زَبَر) کے اُن مصدروں کے ،
جنھیں اُردو میں پہلے حرف کے زیر کے ساتھ بولتے ہیں :۔

جسامت، جہالت، حقارت، حماقت، خطابت، رفاقت اور رذالت؛
اِن سب میں پہلا حرف اُردو تلفّظ کے مطابق زیر کے ساتھ ہے اور شُجاعت کو
شِجاعت بولا جاتا ہے۔

۷۔ فُعُول (ف پر پیش) کے تمام مصادر کا تلفظ عربی کے مطابق ہے،
سوائے ایسے مصادر کے جن کا آخری حرف مُشدّد ہو، جیسے نموّ۔
اِن کی تشدید گر جاتی ہے۔

۸۔ فُعولت کے تمام مصادر کا تلفظ بھی عربی کے مطابق ہے، سوائے مُرُوّت
کے، جسے مُرَوّت کر لیا گیا ہے۔

۹۔ فُعُلان (پہلے حرف پر پیش) اور فِعلان (پہلے حرف پر زیر) کے
مصادر کا تلفظ بھی عربی کے مطابق ہے۔ مگر فَعَلان (پہلے تین حرفوں پر
زبر) کے مصادر کا دوسرا حرف ساکن ہو جاتا ہے، جیسے حَیوان، خَفقان،
خَلجان، دَوران وغیرہ۔

۱۰۔ مَفعَلَہ (پہلے حرف پر زبر، دوسرا ساکن، تیسرے اور
چوتھے پر زبر) کے دو مصدر مَصلحت اور مشیر مَملکت کا تیسرا حرف
زیر کے ساتھ آتا ہے۔

۱۱۔ مَفعِلہ اور فَعِیلہ کے تمام مصادر کا تلفظ عربی کے مطابق ہے۔

۱۲۔ فُعولیّت کے مصادر میں سے ی کی تشدید گرا دی جاتی ہے، جیسے:۔
خُصوصیّت، طفولیّت، عمومیّت کو بلا تشدید خصوصیت، طفولیت،
عمومیت بولتے ہیں۔

(۱۳) اِفعال، اِفالہ، اِفتعال، اِتّعال، اِستفعال، اِستفالہ، انفعال،
تَفَعُّل، تفاعُل، تَفعِیل، تفعِلہ اور تَفَعال کے تمام مصادر کا تلفظ عربی

کے مطابق ہے، سوائے تَفاعُل کے اُن مصادر کا جن کے آخر میں ی تھی اور فارسی والوں نے اُسے الف سے بدل لیا، جیسے تماشی، تقاضی کو تماشا، تقاضا بولتے ہیں۔ اسی طرح تَفَعُّل کے بعض مصدر تمنّی، تجلّی کو تمنّا، تجلّا بولتے ہیں، اگرچہ تجلّی بھی آتا ہے۔

۱۳۔ مُفَاعَلَہ کے تمام مصادر کے چوتھے حرف پر اُردو میں زیر آتا ہے، جیسے مُباحِثہ، مُشاعِرہ، محاسِبہ، معائنہ، مُکالِمہ، مُدافِعت، مُراسِلت وغیرہ۔

۱۴۔ مُفَاعَاۃ کے بعض مصادر کا پہلا حرف اُردو میں زبر سے آتا ہے، جیسے مَفاجات، مَساوات، مَوالات اور بعض کی آخری ت فارسی والوں کی طرح گرا دیتے ہیں، جیسے مُداوا، مُحابا۔

۱۵۔ فَعْلَلَہ (مثلاً زَلْزَلہ، تَرْجَمہ) کے مصادر میں شَعْبدہ کو ش کے پیش کے ساتھ شُعبدہ اور تَرجُمہ (ج پر پیش) بولتے ہیں اور تَفَعْلُل کے سب مصدر جوں کے توں بولے جاتے ہیں، جیسے تَمَسْخُر، تَذَبْذُب، تَسَلْسُل وغیرہ۔

جمع | اس کے تمام اوزان پر آنے والے الفاظ کا تلفظ بالکل عربی کے مطابق ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جمع کے یہ طریقے صرف علما کی بول چال میں آتے ہیں۔ صرف ایک لفظ نوّاب (نائب کی جمع) اُردو میں واحد آتا ہے، اور اس کا تلفظ نَوَاب اور کبھی کبھی نوّاب ہوتا ہے۔

اسمِ فاعل | اس کے بھی تمام اوزان کے الفاظ کا تلفظ، اوپر ہی کی وجہ کے مطابق، عربی تلفظ کی طرح ہوتا ہے۔ البتہ فاعِلہ کے وزن پر آنے والے بعض الفاظ کا، جو عوامی بول چال میں بھی رائج ہیں، تیسرا حرف ساکن ہو جاتا ہے، جیسے داخلہ، حادثہ، ضابطہ، ہاضمہ۔

اسم مفعول سب اوزان کا تلفّظ عربی کے مطابق ہے، سوائے مُجاز کے، جسے اُردو میں مَ کے زَبر (مَجاز) کے ساتھ بولتے ہیں۔

اَسمائے مبالغہ و اَسمائے آلہ و اسمائے پیشہ وراں سب عربی تلفظ کے مطابق ہیں۔ اسمائے ظرف کے تلفّظ میں البتہ کہیں کہیں فرق ہے اور وہ الفاظ یہ ہیں:-

مُفْعَل (تیسرے حرف پر زبر) کے اِن اسمار کا تیسرا حرف زَبر کے ساتھ آتا ہے: مَنصَب، مجلَس، مَقصَد، مَرجَع، مَطلَع، مَوضَع، مَوقَف، مَوسَم۔

فارسی حاصل مصدر فارسی کے وہ حاصل مصدر، جو صیغۂ امر پر شین بڑھانے سے بنتے ہیں، اُردو میں فارسی تلفّظ کے مطابق بولے جاتے ہیں، جیسے :- آزمائش، آسائش، بارش، کشش، وغیرہ۔

فائدہ ا- میں نے عربی مصادر، اسمائے فاعل و مفعول وغیرہ کے بیان میں بے حد اختصار سے کام لیا ہے۔ کیونکہ ہر ہر لفظ کا لکھنا طوالت سے خالی نہیں، جو حضرات اس کی تفصیل چاہیں وہ لُغات دیکھ کر معلوم کر سکتے ہیں۔

۲- تلفّظ کی یہ فہرست دیکھ کر ہر ایک اندازہ لگا سکے گا کہ ہر لفظ کا تلفّظ، اُوپر درج کیے ہوئے کسی نہ کسی اُصول تلفّظ کے تحت آتا ہے اور ایسے الفاظ کی اکثریت ہے جن کا تلفّظ صوتی اصولوں میں سے کسی نہ کسی کے تحت آتا ہے، اِنہی اصولوں پر قیاس کر کے باقی الفاظ کا بھی، جو اس فہرست میں آنے سے رہ گئے ہیں، تلفّظ متعیّن کیا جا سکتا ہے اور اگر مزید الفاظ درج کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی تو اِن شاء اللہ آئندہ طباعت میں اضافہ کر دیئے جائیں گے۔

پانچواں باب

روایت

روایت کے معنی ہیں کسی دوسرے شخص کی بات کو بیان کرنا۔ اسے انگریزی میں (Narration) کہتے ہیں۔

کسی دوسرے کی کہی ہوئی بات دُہرانے کے دو طریقے ہو سکتے ہیں:-

۱- روایت باللفظ (Direct Narration) یعنی دوسرے کی بات کو ہو بہو اُسی کے الفاظ میں دُہرانا۔

۲- روایت بالمعنیٰ (Indirect Narration) یعنی دوسرے کی بات کا مطلب اپنے لفظوں میں بیان کر دینا۔

اُردو میں فارسی کی طرح روایت باللفظ اور بالمعنیٰ کے الگ الگ واضح قاعدے ابھی تک نہیں بنے ہیں اور اسی لیے اہل زبان بھی دونوں طرح کی روایتوں کو ایک دوسری میں گڈمڈ کر دیتے ہیں، اس کے لیے صحیح ترین اور مکمل قاعدے انگریزی اور پھر عربی ہی میں ملتے ہیں۔ اُردو میں انداز بیان اتنے بہت سے ہیں کہ روایت باللفظ اور بالمعنیٰ کے الگ الگ قواعد بنانے بہت مشکل ہیں۔

انگریزی طریقہ یہ ہے کہ روایت باللفظ کو داوین (Inverted Commas) میں لکھتے ہیں اور اس سے پہلے حرف بیانیہ That (جس کا اُردو مترادف "کہ" ہے،) نہیں لاتے لیکن جب اُسی جملے کو روایت

بالمعنی میں بدلتے ہیں تو اُس سے پہلے That بھی لاتے ہیں، اُس پر واوین بھی نہیں لگاتے، اور جملۂ روایت کے فعل کا زمانہ بھی بدل دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ فعل روایت بھی (جو جملۂ روایت سے پہلے آتا ہے) عموماً بدل دیتے ہیں۔ مثلاً

۱۔ اُس نے کہا "میں لاہور جانے والا ہوں"۔ (روایت باللفظ)

۲۔ اس نے بتایا کہ وہ لاہور جانے والا تھا (روایت بالمعنی)

دیکھئے پہلا جملہ دوسرے میں بدل کر کتنا مختلف ہو گیا۔ کہا کی جگہ بتایا آ گیا، میں کو وہ سے بدل دیا گیا، ہوں کا تھا بنا دیا گیا۔ اور پہلے جملے میں سے واوین اُڑا کر کہ بڑھایا گیا۔

لیکن اُردو میں اتنی بہت سی تبدیلیوں کی گنجائش نہیں۔ انگریزی بول چال میں تو اسی طرح آتا ہے، مگر اُردو میں نہیں۔ خصوصاً انگریزی طریقے کی سب سے اہم تبدیلیاں یعنی روایت باللفظ میں کہ نہ آنا اور روایت بالمعنی میں سوائے چند صورتوں کے فعل کا زمانہ بدل جانا، اُردو میں مطلق نہیں ہوتیں لہٰذا اُردو میں روایت کے قواعد ذرا مختلف ہوں گے اور ان کا تعلق بھی زیادہ تر تحریر سے ہوگا، تقریر سے نہیں۔

۱۔ سب سے ضروری اُمر اس سلسلے میں یہ ہے کہ روایت باللفظ پر واوین ہر حال میں لگائیے۔ اس طرف سے اُردو کے بڑے بڑے ادیب غفلت برتتے ہیں، حالانکہ یہ انتہائی ضروری ہے۔ ورنہ پھر روایت باللفظ اور بالمعنی میں کوئی فرق نہیں رہتا۔ اور اکثر پڑھنے والوں کو دقت پیش آتی ہے۔ مثلاً

اُس نے مجھ سے کہا کہ میں امتحان میں پاس ہو گیا ہوں۔

یہاں یہ مشکل پیش آسکتی ہے کہ کہنے والا پاس ہوا یا روایت کرنے والا؟ پس ایسے موقعوں پر واوین تو ضرور ہی لگائیے اور بہتر ہو کہ حرفِ بیانیہ کہ اس میں نہ لائیے۔ یعنی اس طرح لکھیے:-

اُس نے مجھ سے کہا "میں امتحان میں پاس ہو گیا ہوں۔"

اور اگر واوین نہ لگائیں تو اس کو بالمعنی میں بدل دیجیے، اس طرح:-

اُس نے مجھ سے کہا کہ وہ امتحان میں پاس ہو گیا ہے۔

دیکھیے، یہاں انگریزی کے برخلاف دوسرے فعل کا زمانہ نہیں بدلا۔

اِسی طرح یہ جملہ:- اُس نے میرا تعارف کرایا کہ آپ میرے کرم فرما ہیں۔

اس کی دونوں صورتیں اس طرح لکھیے:-

اس نے میرا تعارف کرایا "آپ میرے کرم فرما ہیں" (باللفظ)

اُس نے میرا تعارف کرایا کہ میں اُس کا کرم فرما ہوں (بالمعنی)

۲- پیچیدہ قسم کے جملوں میں اُوپر کی بتائی ہوئی باتوں کا خاص خیال رکھیے، جیسے:-

وہ مجھ سے کہنے لگا کہ حامد مجھے ملا تھا اور کہتا تھا کہ تم نے اس معاملے میں بڑی غلطی کی۔ یہاں "تم" کون ہے؟ یہ پوری بات کہنے والا یا سننے والا؟ کچھ نہیں معلوم ہوتا۔ پس ان جملوں میں، جہاں تابع جملے، ایک کے بعد دوسرا، پے درپے آئیں، دوسرا تابع جملہ بالمعنی لکھیے اور پہلا باللفظ۔ پس اُوپر کے جملے میں اگر "تم" کا مطلب، "سننے" والا ہے تو یہ جملہ اس طرح بنائیے:-

وہ مجھ سے کہنے لگا۔ "حامد مجھے ملا تھا اور کہتا تھا کہ تم نے اس معاملے میں بڑی غلطی کی۔" اور اگر "تم" سے مُراد "بولنے" والا ہے تو اس طرح:-

وہ مجھ سے کہنے لگا: "حامد مجھے ملا تھا اور کہتا تھا کہ میں نے اس معاملے میں بڑی غلطی کی۔" اور اگر "تم" کے بجائے ضمیر اشارہ حامد کی طرف لانا ہو تو یُوں لکھیے:-

وُہ مجھ سے کہنے لگا: "حامد مجھے ملا تھا اور کہتا تھا کہ اُس نے (یعنی حامد نے) اس معاملے ...."

۳۔ زمانے کا تعین اگر اسم ظرف سے کیا جائے تو بالمعنی میں اس کا بدلنا ضروری ہے۔ جیسے :۔

اُس نے کہا: "میں آج لاہور جا رہا ہوں" (باللفظ)

اس نے کہا کہ وہ اُس دن لاہور جا رہا ہے (بالمعنی)

لیکن ایسے جملوں میں زیادہ تر روایت باللفظ بہتر ہوتی ہے۔ بالمعنی کا رواج بالکل نہیں۔

۴۔ خیال کو روایت بالمعنی میں لانا بہتر ہے۔ جیسے :۔

باللفظ :۔ اُس نے طے کر لیا کہ[1] "اس کام کو کرکے ہی اُٹھوں گا"

بالمعنی :۔ اس نے طے کر لیا کہ اس کام کو کرکے ہی اُٹھے گا۔

باللفظ :۔ اگر کوئی یہ سمجھے کہ "میں بہت نیک ہوں" تو وہ فریبِ نفس میں مبتلا ہے۔

بالمعنی :۔ اگر کوئی یہ سمجھے کہ وہ بہت نیک ہے تو وہ فریبِ نفس میں مبتلا ہے۔

---

[1] اس جملے میں "کہ" لانا جائز ہے مگر واوین لگانا ضروری ہے۔

چھٹا باب

اوقاف

قدیم اُردو میں اوقاف (Punctuation) لگانے کا بہت ہی کم رواج تھا۔ اور جو اوقاف رائج تھے، وہ ناکافی بھی تھے۔ اور آج کل کے اوقاف سے مختلف بھی۔ لیکن اب آہستہ آہستہ اُردو میں بھی مختلف اوقاف لگانے کا رواج ہوتا جا رہا ہے۔ لیکن اب بھی اس امر میں بہت لاپروائی برتی جاتی ہے، حالانکہ ایک ترقی یافتہ زبان کے لیئے اوقاف ناگزیر ہیں۔ اس لیے ہم یہاں اوقاف کے مختلف قواعد تفصیل سے لکھتے ہیں۔ یہ قواعد مولوی عبدالحق صاحب کی کتاب قواعد اُردو سے نقل کیے گئے ہیں۔

اوقاف (جمع وقف) وہ علامتیں ہیں جو ایک جملے کو دوسرے جملے یا جملے کے ایک حصّے کو دوسرے حصّے سے علیٰحدہ کریں۔ ان کا فائدہ یہ ہے کہ اوّل تو ان کی وجہ سے نظر کو سکون ملتا ہے اور وہ تھکنے نہیں پاتی، دوسرے، ذہن ہر جملے یا جزوِ جملہ کی اصلی اہمیت جان لیتا ہے اور مطلب سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔

اُردو میں تقریباً تمام اوقاف انگریزی سے لیے گئے ہیں، لیکن اکثر میں حسبِ ضرورت کچھ تبدیلی کر دی گئی ہے۔ تمام اوقاف کے نام اور شکلیں حسبِ ذیل ہیں:۔

انگریزی	اُردو نام	اُردو علامتیں	کیفیت
۱۔ Comma	سکتہ	،	یہ سب سے چھوٹا ٹھیراؤ ہے

یہ سکتے سے کسی قدر طویل ٹھیراؤ ہے	؛	وقفہ	Semicolon -۲
یہ مکمل ٹھیراؤ ہے	-	ختمہ	Fullstop -۳
	:	رابطہ	Colon -۴
	:-	تفصیلیہ	Colon and Dash -۵
	؟	سوالیہ	Note of Interrogation -۶
	!	فجائیہ۔ندائیہ	Note of Exclamation -۷
	( ) یا [ ]	قوسین	Brackets -۸
	—	خط	Dash -۹
	" "	واوین	Inverted Commas -۱۰

ان علامتوں کا استعمال

○

سکتہ (،) | یہ سب سے چھوٹا ٹھیراؤ ہے ، اور ان موقعوں پر استعمال ہوتا ہے:
۱ - ایسے اسماء کے بیچ میں جو ایک دوسرے کے بدل ہوں -
جیسے :- " جہاں گیر، ابنِ اکبر، شاہنشاہِ ہندوستان ، نے .... "
۲ - ایک ہی حالت کے تین یا زیادہ متصل لفظوں کے بیچ میں (ایسی صورت میں دو لفظوں کے درمیان حرفِ عطف یعنی "و" یا "اور" ، یا حرفِ تردید یعنی "یا" آتا ہے) جیسے :-
(الف) حیدرآباد ، میسور اور ٹراونکور جنوبی ہند کی ریاستیں ہیں -
(یہاں پہلے تینوں لفظ اسم ہیں اور تینوں حالت فاعلی میں ہیں ۔)

(ب) چوری کرنا مذہباً ، اخلاقاً ، قانوناً اور رسماً نہایت مذموم فعل ہے۔
(یہاں چاروں اسمائے حال یعنی Adverbs ہیں)
(ج) اکبر بہت عقل مند ، وسیع النظر ، ہمدرد اور مدبّر بادشاہ تھا۔
(اسمائے صفات)
۳ ۔ ندائیہ لفظوں کے بعد، جیسے :۔
(الف) "جناب صدر ، خواتین وحضرات"
(ب) "اے ماؤ ، بہنو ، بیٹیو ۔"
(ج) "عزیز من ، دُعا"
۴ ۔ ایک ہی درجے کے جوڑا جوڑا استعمال ہونے والے لفظوں اور فقروں کے درمیان ، جیسے :۔
"دن ہو کہ رات ، سفر ہو کہ حضر ، خلوت ہو یا جلوت ، انسان کو چاہیئے کہ خدا کو نہ بھولے ۔"
۵ ۔ جملے کی تشریحی اجزاء کے درمیان، جیسے :۔
"یہ چبوترا تیس فیٹ لمبا ، بیس فیٹ چوڑا ، پانچ فیٹ اُونچا ہے ۔"
۶ ۔ بڑے جملے کے چھوٹے اجزاء کے درمیان ، جن میں سے ہر جُز اپنی جگہ جُملہ ہو ۔ جیسے :۔
(الف) میں گھر سے بازار گیا ، بازار سے مدرسے آیا ، اب پھر گھر جاتا ہوں ۔
(ب) وہ کھیل کر آیا ، نہایا ، کپڑے بدلے ، چائے پی ، اور سیر کو چلا گیا۔
(ج) کھیلنے کے وقت کھیلو ، پڑھنے کے وقت پڑھو ۔
۷ ۔ شرط اور جزا یا صلہ اور موصول بیان کرنے والے جملوں کے بیچ میں ،

بشرطیکہ ان جملوں کے درمیان تو یا تب نہ آئے[1]۔ جیسے :۔

(الف) اُس کے منہ جو کوئی لگا، ذلیل ہی ہوا۔

(ب) اگر ہم جانتے داغِ جُدائی، نہ کرتے اتنی الفت تم سے بھائی۔

۸ ۔ دو سادہ جملوں کے بیچ میں، جب ایک جملہ دوسرے کی توجیہہ کرے، جیسے :۔

(الف) میں وہاں اُس کے پاس نہیں گیا، اس لیے کہ وہ خود ہی میرے ہاں آ پہنچا۔

(ب) اُسے گھر بیٹھے نوکری مل گئی، پھر باہر کیوں جاتا؟

(ج) خوب دوڑا کرو، جس میں بھوک اچھی طرح لگا کرے۔

۹ ۔ ایسے حالیہ معطوفہ[2] کے بعد، جس کی علامت کر ساقط کر دی گئی ہو، جیسے :۔

(الف) وہ چھڑی ہاتھ میں لے، نکل کھڑا ہوا۔

(ب) وہ یہ جا، وہ جا، چمپت ہو گئی۔

۱۰ ۔ مبتدا اور خبر کے درمیان، اگر کوئی حجاب نہ ہو۔ جیسے :۔

(الف) یہی انتخابِ مضامین، مطبوعہ رسالے کا نہایت عمدہ اشتہار

---

[1] مولوی عبدالحق صاحب نے یہ شرط نہیں رکھی ہے، لیکن میری رائے میں ضروری ہے۔ تو اور تب خود سکتے کا کام دیتے ہیں۔ البتہ اگر جملہ بہت طویل ہو تو تو اور تب سے پہلے سکتہ لانا جائز ہے۔

[2] حالیہ معطوفہ اس طرح کے لفظ ہوتے ہیں جیسے آکر، جاکر، لیٹ کر، وغیرہ۔ کبھی آکے، جاکے، بھی لکھتے ہیں۔

بھی بن گیا۔ (یہاں اگر مضامین کے بعد سکتہ نہ لگایا جائے تو اگلے لفظ مطبوعہ رسالے کے ساتھ گڈمڈ ہو جائے گا)

(ب) مسدس، حالی کی سب سے ممتاز تصنیف ہے۔

(ج) نذیر احمد کی سب سے عام پسند کتاب، مراۃ العروس ہے۔

(د) خودی، خدا اور انسان کے درمیان ایک رابطہ ہے (یعنی خدا اور انسان کے مابین خودی ایک رابطہ ہے۔)

۱۱۔ عبارت، خصوصاً شعر کی تعقید دور کرنے کے لیے۔ جیسے :۔

(الف) کتنے ہی لوگ مولویوں کی باتوں کو، جو انھوں نے اپنے ذہن کی تیزی سے نکالی ہیں، سند پکڑتے ہیں؛ اور کتنے، اپنی عقل کو دخل دیتے ہیں۔

(ب) تار ریشم کا نہیں، ہے یہ رگ ابر بہار

(ج) دلوار، بار منت مزدور سے، ہے خم۔

وقفہ : ان موقعوں پر آتا ہے :۔

۱۔ جملوں کے لمبے لمبے اجزاء کو ایک دوسرے سے علیحدہ کرنے کے لیے (سکتوں کے استعمال کے علاوہ)، جیسے :۔

حق یہ ہے کہ اس زمانے میں، جب کہ قومی تپش نما کا پارا ہر گھڑی گھٹتا بڑھتا رہتا ہے؛ جب کہ باوجود تعلیمی کاموں کی کثرت کے، قومی تعلیم کا کوئی صحیح خاکہ ہمارے سامنے نہیں ہے، جب کہ سیاسی تار و پود سارے ملک میں پھیلا ہوا ہے۔ مگر کوئی طریقہ قومی فلاح کا ایسا نہیں، جس پر تمام جماعتیں متفق ہو سکیں؛ جب کہ باوجود سادگی کے ادعا کے، عیش پرستی کے بہت سے چور دروازے کھلے ہوئے ہیں؛ جبکہ باوجود ایثار اور قربانی کے دعووں کے،

حقیقی ایثار اور ضبط نفس بہت کم نظر آتا ہے، نواب وقار الملک کی سیرت ایک بڑی نعمت ہے۔

۲۔ جہاں جملوں کے مختلف اجزاء پر زیادہ تاکید دینا مدِنظر ہو؛ جیسے :-

(الف) جو کرے گا سو پائے گا ؛ جو بوئے گا سو کاٹے گا۔

(ب) آنا، تو خفا آنا ؛ جانا، تو رُلا جانا۔

(ج) تم روئے اور ہمارا دل بے چین ہوا ؛ تمھاری انگلی دکھی تو ہمارے دل پر چوٹ لگی ؛ مصیبتیں ہم نے بھریں ؛ تکلیفیں ہم نے اٹھائیں ؛ غرض جان، مال، آرام سب کچھ تمھارے لیے تج دیا۔ کیا اس کا یہی صلہ ہے ؟

۳۔ جن جملوں کے بڑے بڑے اجزا کے درمیان ورنہ، اس لیے، لہٰذا، اگرچہ، چہ جائیکہ، دراں حالیکہ، لیکن، اور اسی قسم کے ربط دینے والے الفاظ آئیں وہاں ذہن کو سمجھنے کا موقع دینے کے لیے ان لفظوں سے پہلے وقفے کی علامت لگائی جاتی ہے۔ (مگر واضح رہے کہ چھوٹے جملوں میں ایسے موقعوں پر سکتہ کافی ہوتا ہے) جیسے :-

(الف) چونکہ نکاح سے قبل ہی نسبت توڑ دی گئی، اور لڑکی چچا سے علیحدہ کر لی گئی ؛ اس لیے ایسی شادی سے جو مذموم نتائج پیدا ہوتے ان کا موقع ہی نہیں آیا۔

(ب) ہندوستان جیسے ملک میں، جہاں زندگی کا ہر پہلو قابلِ اصلاح ہے، اور معاشرت کے ہر شعبے میں تذبذب اور انتشار بپا ہے ؛ فن کی بعض نازک اور خیالی خوبیوں کو قربان کر سکتے ہیں ؛ بشرطیکہ وہ ادب پارہ سلیقے

سے الگ کیا جائے۔

۴۔ جملے کے ایسے حصوں کو، جن میں اندرونی طور پر سکتہ موجود ہو، جدا کرنے کے لیے، جیسے:۔

(الف) حیدر آباد، میسور اور ٹراونکور، جنوبی ہند کی بڑی ریاستیں ہیں؛ بھوپال، گوالیار اور اِندور وسطِ ہند کی؛ اور بہاول پور، پٹیالہ اور کشمیر، شمالی ہند کی۔

(ب) حالؔی کی مسدس، یادگارِ غالبؔ، حیاتِ جاوید؛ نذیر احمد کی مراۃ العروس، بنات النعش، توبۃ النصوح؛ شبلؔی کی الفاروق، موازنہ، سیرۃ النبیؐ؛ پڑھنے اور بار بار پڑھنے کے قابل ہیں۔

رابطہ: اس کا ٹھیراؤ وقفے سے زیادہ ہوتا ہے۔ اس کا اِستعمال ہوتا ہے:۔

۱: جب جملے کے کسی سابقہ خیال یا بات کی تشریح یا تصدیق کی جائے، جیسے:۔

(الف) ہمیشہ اپنی صحت کا خیال رکھو: اگر کوئی نعمت ہے تو یہی ہے۔

(ب) کیا خوب سودا نقد ہے: اس ہاتھ دے، اُس ہاتھ لے۔

(ج) کاوِ کاوِ سخت جانیہائے تنہائی نہ پوچھ:
صبح کرنا شام کا، لانا ہے جُوئے شیر کا

۲۔ کسی مختصر مقولے یا کہاوت بیان کرنے سے پہلے، جیسے:۔

(الف) کسی حکیم کا قول ہے: آپ کاج مہا کاج

(ب) سچ ہے: گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں

۴۔ جب دو جملوں میں سے ایک، دوسرے کی توجیہہ کرے، مگر کوئی حرفِ توجیہہ اُن کے بیچ میں نہ ہو۔ جیسے :۔

بچوں کو تنہائی میں نصیحت کرنا چاہیے؛ سب کے سامنے نصیحت کرنے کا اثر اُلٹا ہوتا ہے۔

(یہاں دونوں جملوں کے بیچ میں کیونکہ آنا چاہیئے تھا۔ مگر اس کی جگہ رابطے نے وہ کام دے دیا۔)

تفصیلیہ :۔ اس کا استعمال ان موقعوں پر ہوتا ہے :۔

۱۔ کسی طویل اقتباس یا فہرست کو پیش کرتے وقت جیسے :۔

(الف) مرزا غالب فرماتے ہیں :۔

(ب) ہندوستان کے بڑے شہر یہ ہیں :۔

۲۔ ایک ہی جملے میں کئی کئی باتیں مسلسل پیش کرنے کے لیے، جیسے :۔

(الف) کچھ میری روزانہ زندگی کا حال سنو :۔ علی الصباح اُٹھا، ضروریات سے فارغ ہو کر، نہا دھو کر ناشتا کیا، ڈاک دیکھی، اگر موسم خوشگوار ہو گیا تو چھڑی لے کر ٹہلنے چلا گیا، ورنہ گھر ہی میں رہا۔

(ب) ناریل کے فوائد بے شمار ہیں :۔ اس کا تیل جلاتے ہیں، کھانے میں ڈالتے ہیں، خول سے ڈونگے بنتے ہیں؛ ریشہ رسیوں کے بٹنے میں کام آتا ہے؛ کچا ہو تو اس کا پانی پیتے ہیں۔

ختمہ۔ یہ علامت مکمل جملے کے خاتمے پر لگائی جاتی ہے، جہاں ٹھہراؤ بھرپور ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ مخففات (Abbreviations) کے بعد بھی لگاتے ہیں، اگر صرف انگریزی کے حروف ہیں، جیسے ایم۔ اے ؛

پی۔ایچ۔ڈی۔ بار ایٹ لا۔" یا "کے۔سی۔آئی۔ای۔"، وغیرہ۔

نوٹ:۔ ختمہ اور خط میں استعمال کے لحاظ سے بھی فرق ہوتا ہے (جیسا کہ آگے چل کر خط کے استعمال سے معلوم ہوگا) اور تحریر میں بھی ختمہ چھوٹی لکیر (-) ہوتی ہے، اور خط خاصی بڑی (———)

واوین " " | جب کسی کے قول کی روایت بالفظ کی جائے، یا کسی خاص لفظ یا جملے پر زور دینا ہو، یا کسی لفظ کو مذاق یا حقارت کے طور پر غلط معنوں میں لکھنا ہو تو واوین کا استعمال کیا جاتا ہے، جیسے:۔

۱۔ اس نے کہا "میں کل دس بجے پہنچوں گا۔"

۲۔ جی ہاں میں ابھی "تشریف رکھتا ہوں۔" (یہاں "تشریف رکھنا" بطور مذاق آیا ہے۔)

فجائیہ (!) اور سوالیہ (؟) علامتیں اُردو میں اب عام ہوگئی ہیں، اس لیے ان کے بارے میں کچھ کہنا بے کار ہے۔ اسی طرح توسین ( ) کا بیان بھی تحصیل حاصل ہوگا۔

خط ــــ | اس کا استعمال ہوتا ہے:۔

۱۔ جملہ معترضہ کے اوّل و آخر میں، جیسے:۔

(الف) میری رائے تو ــــ اگرچہ میں کیا اور میری رائے کیا ــــ یہ ہے کہ آپ اس سے دست بردار ہو جائیں۔

(ب) جب مسجد کے مولوی صاحب ــــ اور یہ مولوی صاحب بھی بعد کو ایک ناصح مشفق "ثابت ہوئے ــــ نہ ہوتے تھے تو نماز آپ ہی پڑھایا کرتے تھے۔

۲۔ جب کئی لفظ کسی سابقہ لفظ کی تشریح اور تبادلے میں

لکھے جائیں ، جیسے :-

"سارا مکان ــــ اینٹ ، چُونا ، سامان ، لکڑیاں ــــ سب جَل کر خاک ہو گیا۔"

Scanned with CamScanner

ساتواں باب

اچھی زبان کیوں کر لکھی جائے

اب سے کچھ عرصہ پہلے اچھی زبان کا مطلب "کوثر کی دُھلی، نھتری، ٹکسالی اور محاورہ" زبان لیا جاتا تھا اور ظاہر ہے کہ یہ زبان ہر ایک نہیں لکھ سکتا تھا لیکن یہ بھی حقیقت ہے، کہ ایسی زبان کی کوئی مستقل اور سنجیدہ قدر و قیمت نہ ہو سکتی تھی اور خود یہ زبان بھی چند شاعرانہ یا روزمرہ کی گھریلو دلچسپیوں کے سوا، کسی قسم کے اعلیٰ ادبی علمی یا تنقیدی خیالات ظاہر کرنے سے قاصر تھی۔ لیکن اب زبان کی اچھائی بُرائی کا معیار بدل گیا ہے۔ اب ایک ادیب کے لیے یہ ضروری ہے کہ ایک ایک لفظ اور جملے کو اس طرح تول تول کر لکھے کہ متانت اور عالمانہ شان بھی ٹپکتی ہو اور ہر قسم کے پُرمغز اور گہرے خیالات کا اظہار بھی ہو سکے۔

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ایک شخص غلط زبان لکھ کر بھی محض اپنے خیالات کی بدولت اچھا ادیب کہلایا جائے گا۔ زبان کا صحیح ہونا پہلی شرط ہے۔ اس کے بعد کسی اور بات کی باری آتی ہے۔ نیز، آج کل "بامحاورہ" زبان یا عبارت کا یہ مطلب نہیں کہ اس میں محاوروں اور ضرب المثلوں کی بہتات ہو۔ اس کا مقصد صرف روزمرہ کی بے تکلف اور صحیح زبان ہے۔

اس کے لیے چند موٹے موٹے اصول پیش کیے جاتے ہیں جن پر عمل کرنے سے بہتری کی اُمید ہو سکتی ہے۔

۱۔ سب سے پہلا اصول، جو ہمیشہ آپ کے پیش نظر رہنا ضروری ہے، اختصارِ کلام ہے۔ جس طرح کم بولنا عقل اور علم کی نشانی ہے، اسی طرح کم سے کم الفاظ لکھنا اور بولنا ایک ترقی یافتہ علمی زبان کی خصوصیت ہے۔

اس کی ایک صورت تو یہ ہے۔ کہ ایک بات کو بار بار مختلف پیرایوں میں نہ کہا جائے۔ جو بات ہو اس کے لیے اُتنے ہی لفظ خرچ کیے جائیں، جتنے ناگزیر ہوں، اور ایک دفعہ سے زیادہ نہ کہا جائے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ مترادفات (ہم معنی الفاظ) جہاں تک ہو سکے نہ لکھے جائیں، مثلاً:۔

امانت و دیانت، صبر و تحمل، قناعت و توکل، شجاعت و دلیری، تقویٰ اور خدا ترسی بندۂ مومن کی صفات ہیں۔"

اس جملے میں دو دو الفاظ کے جوڑے بالکل بے کار ہیں۔ ایک ایک لفظ سے بھی پورا پورا مطلب ادا ہو سکتا ہے۔ یہ دونوں صورتیں، یعنی ایک بات کی تکرار اور مترادفات کا استعمال قدیم فارسی و عربی تحریر کا طرۂ امتیاز ہیں۔ بعض بعض ادیب تو یہاں تک غضب کرتے ہیں کہ تین تین چار چار صفحے کی عبارت ہیں کام کی بات زیادہ سے زیادہ ایک چھوٹے سے پیراگراف میں آ سکتی ہے۔ فارسی والوں نے اس اسلوب کو بے حد ترقی دی۔ اور اس کا اثر عربی پر بھی پڑا۔ ورنہ اس سے پہلے عربی بہت سادہ اور "اختصار پسند" زبان تھی یہی اسلوب فارسی سے اردو میں آیا۔ مگر اس کا فائدہ کیا ہے؟ سوائے اس کے کچھ نہیں کہ کچھ شاعرانہ نثر کا لطف آ جائے اور لکھنے والے کی قابلیت کا سکہ بیٹھ جائے لیکن ظاہر ہے کہ علمی مطالب کے لیے یہ طرز و اسلوب قطعاً بے کار ہے۔ مثال کے طور پر ملا ظہوری کی سہ نثر ملاحظہ ہو، جو بادشاہ ابراہیم عادل شاہ (دکن) کی

کتاب نورس کا دیباچہ ہے، پوری عبارت اوّل سے آخر تک پڑھ جائیے، یہی نہ معلوم ہو سکے گا کہ بادشاہ نے جو کتاب لکھی ہے۔ اُس کی ادبی یا فنی قدر و قیمت کیا ہے۔

اختصار کی تیسری صورت الفاظ کی "چھانٹی" ہے جس جگہ ایک لفظ سے کام چل سکتا ہو، وہاں دو لانا بالکل غیر ضروری ہے۔ یہ بظاہر بہت معمولی سی بات ہے، لیکن اس سے بھی لکھنے والے کی لیاقت ظاہر ہوتی ہے۔ بلکہ اہلِ زبان تو آپ بولنے میں بھی اسے ملحوظ رکھتے ہیں۔ عرصہ ہوا، میں لاہور میں ایک دکان پر گیا اور کریانے کی کوئی چیز مانگی۔ مالکِ دُکان نے، جو اپنی زبان سے اطرافِ دہلی کا معلوم ہوتا تھا، کہا کہ اس کے پاس وہ چیز نہیں، مگر، اُس نے کہا:۔

"آپ لاہوری دروازے دیکھ لیجئے۔ وہاں ملی، ملی نہیں، اکبری منڈی ملے گی"

یہ الفاظ اُسی وقت میرے ذہن میں جم گئے اور آج تک یاد ہیں۔ کیونکہ اس جملے میں اس قدر اختصار ہے کہ شاید تار کی عبارت بھی اس سے زیادہ مختصر نہ ہوگی۔ اُسی وقت مجھے خیال آیا کہ کوئی اور، الفاظ کا ضائع کرنے والا اس بات کو کس طرح ادا کرتا؟ شاید اس طرح:۔

آپ لاہوری دروازے کی دکانوں پر جا کر دیکھ لیجئے۔ اگر وہاں مل گئی تو مل گئی، اور نہیں، تو پھر آپ کو اکبری منڈی میں ضرور مل جائے گی"

دونوں جملوں کا فرق آپ خود دیکھ سکتے ہیں۔ پس یہ ضیاعِ الفاظ اُردو ہی نہیں، ہر ترقی یافتہ زبان کے لیے باعثِ ننگ ہے۔ جہاں تک ہو سکے۔ چھوٹے چھوٹے الفاظ کفایت کے ساتھ استعمال کیجئے۔ مثلاً:۔

"میں غسل کرنے کے لیے جا رہا ہوں"

سے بہتر یہ جملہ ہوگا۔

"میں نہانے جا رہا ہوں" (غسل کرنے کی جگہ نہانے، اور "کے لیے" بالکل ساقط) اسی طرح اور جملوں میں بھی اس کا لحاظ رکھیے کہ کم سے کم الفاظ آئیں۔

ہمارے اخبار نویس الفاظ و عبارات کا سب سے زیادہ فضول استعمال کرتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اخبار نویسی کی یہ کوئی خوبی ہے۔ حالانکہ شاید سب سے زیادہ اخبار نویسی ہی اختصار چاہتی ہے۔ میں نے ۱۹۴۲ء کے ادبِ لطیف کے کسی خاص نمبر میں مشہور صحافی مولانا عبدالمجید سالک کا لیکچر پڑھا تھا۔ جس میں اُنھوں نے کسی مشہور مغربی اخبار نویس کی یہ ہدایت نقل کی تھی۔ "اڈیٹوریل اس طرح لکھو، گویا تمھیں آسٹریلیا کو ایکسپریس تار بھیجنا ہے۔ اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ یورپ میں بھی جو اخبار نویسی کا جگت اُستاد ہے اخبار کا مختصر ترین عبارت میں ہونا معیاری سمجھا جاتا ہے۔

۲۔ دوسرا اہم اصول فارسیت سے پرہیز ہے۔ پہلے اُردو کی خوبی یہی سمجھی جاتی تھی کہ وہ فارسی عربی الفاظ سے گراں بار ہو، فارسی ترکیبیں اُس میں اس کثرت سے ہوں کہ فعل اور حروف (سے، پر، تک، وغیرہ) کے سوا پورا جملہ فارسی معلوم ہوتا ہو۔ جیسے ؎

شمارِ سبحہ مرغوبِ بُتِ مشکل پسند آیا
تماشائے بہ یک کف بُردنِ صد دل پسند آیا غالبؔ

لیکن اب اچھی اُردو کا یہ معیار نہیں رہا۔ اب، جہاں تک ہو سکے، عربی فارسی الفاظ اور ترکیبوں کے بے کار استعمال سے بچیے۔ آج کل اچھی اُردو وہ سمجھی جاتی ہے جو عوام کے روزمرہ سے قریب ترین ہو۔ مثلاً:-

"حکومت نے برائے اعانت سیلاب زدگان ایک رقمِ خطیر منظور کی ہے۔" اس کے بجائے سیدھا سادھا جملہ یہ ہو سکتا ہے :-

"حکومت نے سیلاب زدوں کی مدد کے لیے ایک بڑی رقم منظور کی ہے۔" آج اُسی شخص کو زیادہ لائق اور فاضل سمجھا جاتا ہے جو روزمرہ کی زبان کو متین اُردو پیرایہ دے سکے لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ اُردو روزمرہ میں سے عربی فارسی الفاظ نکال کر ہندی الفاظ بھرے جائیں خواہ وُہ بھی آسان ہی کیوں نہ ہوں۔ مثلاً :-

"مجھے وشواش ہو گیا ہے کہ تمھارا کوئی دوش نہیں۔"

اس جملے میں وشواش اور دوش بہت عام فہم لفظ ہیں۔ مگر یہ اُردو کے مذاق پر گراں گزرتے ہیں۔ ان کی جگہ یقین اور قصور اُردو روزمرہ کے الفاظ ہیں، اور یہی آنے چاہئیں۔

۳۔ تیسرا اُصول یہ ہے کہ خیالات کو گنجلک سے بچائیے۔ آپ بیک وقت بہت سی باتیں کہنا چاہتے ہوں تو پہلے ان کو اپنے ذہن میں صاف کر لیجیے، پھر ایک کے بعد ایک بات کو ترتیب وار علیحدہ علیحدہ سلیقے سے بیان کر دیجیے، اور ہو سکے تو ان کو الگ الگ پیراگرافوں میں لکھیے۔ یہ بات میں خاص طور پر طالب علموں سے کہہ رہا ہوں۔ مجھے اپنے کالج کے طلباؔ کے مضامین اور امتحانی سوالات کے جوابات جانچتے ہوئے سالہا سال گزر چکے اور بمشکل دس فیصدی طلباء کو میں نے پایا ہے کہ اپنا مافی الضمیر صاف صاف ادا کر سکیں؛ زیادہ تر معلوم ہوتا ہے کہ انھیں بہت کچھ یاد ہے، ان کا مطالعہ بھی خاصا ہے مگر جب لکھنے پر آتے ہیں تو کچھ نہیں لکھ پاتے، بقول میرؔ ؎

کہتے تو ہیں کہتے ہم یہ کہتے جو یار آتا
سب کہنے کی باتیں ہیں کچھ بھی نہ کہا جاتا

اس کی وجہ یہی ہے کہ وہ لکھنا نہیں جانتے۔ لہٰذا پہلے خیالات
ذہن ہی میں صاف کر لینا اور پھر لکھنا بہت ضروری ہے۔ اس کے لیے
مشق بھی شرط ہے۔ عام عنوانوں پر آسان اور چھوٹے چھوٹے مضامین
لکھنے سے ابتدا کیجیے، اور رفتہ رفتہ مشق بڑھاتے چلے جائیے۔

۴۔ چوتھا ضروری اصول یہ ہے کہ آپ صرف اپنے ہی لکھنے پر اکتفا نہ کریں، بلکہ
مستند اہلِ زبان ادیبوں کی تصنیفات کا برابر مطالعہ جاری رکھیں اور دیکھیں کہ آپ
سے پہلے سینکڑوں سال تک اُردو کے ادیبوں نے اپنی جودتِ طبع سے اظہارِ
خیالات کے کیا کیا اسالیب ڈھالے ہیں۔ اس طرح مطالعہ کرتے رہنے سے
آپ کی اپنی مشقِ تحریر بھی بڑھے گی اور علمیت بھی۔

یہ اصول ہر زبان میں بہت پہلے سے چلا آتا ہے اور ہر زمانے میں مسلّم رہا
ہے لیکن ہمارے زمانے میں شہرت پسندی کا چسکا اور اس کے آسان ذرائع اچھی
عبارت لکھنے کے دشمن ہو گئے ہیں۔ ہر وہ طالب علم، جو ابھی میٹرک ہی میں ہوتا ہے بے تکلف
قلم اٹھا لیتا ہے اور لکھنے لگتا ہے۔ چھاپنے والے چھاپتے ہیں۔ اور سراہنے والے
سراہتے ہیں کسی کو خیال نہیں ہوتا کہ جو شخص زبان کے تمام پہلوؤں کا علم بھی نہیں
رکھتا ــــ ان پر عبور تو بڑی بات ہے ــــ وہ کس طرح کوئی معقول ادبی
کارنامہ چھوڑ جائے گا؟ اب اگر کوئی سنجیدہ شخص اس کی لسانی بے راہروی پر ٹوکے
تو وہ قدامت پسند، تنگ نظر، اور ترقی کا دشمن قرار دیا جاتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ
اس زمانے کے ادیبوں میں سے بمشکل ہی کوئی نکلے گا جو انیسویں اور ابتدائے
بیسویں صدی کے ادیبوں کی ٹکر کا ہو۔ یہ لوگ اپنی زندگی تک زندہ ہیں۔ بلکہ بعض اس
سے بھی پہلے ختم ہو جاتے ہیں، پھر کوئی پوچھنے والا بھی نہیں ہوتا۔